مطالعہ

مثنوی اسرارِ خودی

ڈاکٹر سکینہ فاضل

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

مطالعۂ مثنوی اسرارِ خودی

ڈاکٹر تسکینہ فاضل

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

★ بار اول —— مارچ ۲۰۰۰ء

★ تعداد —— پانچ سو

★ قیمت —— پچاس روپے

★ مطبع —— شالیمار آرٹ پریس سری نگر

نگردد شعرِ من مشہور تا جاں در تنم باشد
کہ بعد از مرگِ آہو نافہ بیروں مے دہد بُو را

(غنیؔ کشمیری)

انتساب

اپنے شوہر
میر محمد زمان
کے نام
جن کی رفاقتوں نے میری زندگی کی تاریک
راہوں میں اجالے کیئے۔

اگر سیاہ دِلم داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم گُلِ بہار تو ام

فہرست مضامین

☆ تعارف
☆ پیش لفظ
☆ فارسی گوئی کی طرف اقبال کا میلانِ طبع۔ اسباب و محرکات
☆ اسرارِ خودی کے ماتھے کا جھومر۔ مولانا رُومی کا ایک قطعہ
☆ پیشکش بحضور سر سیّد علی امام
☆ اسرار خودی کی تمہید
☆ دیباچہ اسرار خودی
☆ خودی کا مفہوم اور اس کی تشریح
☆ "شخصیت" خودی کی اصطلاح کا پیش خیمہ
☆ معرکۂ اسرار خودی
☆ نظام عالم کے قیام میں خودی کی اساسی اہمیت
☆ خودی کی حیات مقاصد کی تخلیق و تولید سے وابستہ ہے۔
☆ عشق و محبت خودی کے استحکام کا ذریعہ ہے۔
☆ چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

☆ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو کر کائنات کے قوائے ظاہرہ و مخفیہ کو مسخر کرلیتی ہے۔

☆ نفی خودی کا مسئلہ مغلوب اقوام کی اختراع ہے جس کی آڑ لیکر اقوام غالبہ کے اخلاق میں ضعف پیدا کیا جاتا ہے۔

☆ حکیم افلاطون اور حافظ شیرازی کے تخیلات سے احتراز کرنا واجب ہے۔

☆ شعر کی حقیقت اور ادبیات اسلامیہ کی اصلاح

☆ خودی کی تربیت کے تین مرحلے۔ مرحلہ اول اطاعت۔ مرحلہ دوم ضبطِ نفس اور مرحلہ سوم نیابت الٰہی۔

☆ مرحلہ اول۔ اطاعت

☆ مرحلہ دوم۔ ضبطِ نفس

☆ مرحلہ سوم۔ نیابتِ الٰہی

☆ شرح اسرار اسمائے حضرت علی مرتضیٰؓ

☆ کشت انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را برانگیزد ز خواب
(حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ سے ایک نوجوان کی فریادِ ستم دشمنان)

☆ پیاسے پرندے کی حکایت

☆ ہیرے اور کوئلے کی حکایت

☆ حکایت شیخ و برھمن اور گنگا و ھمالہ کا مکالمہ

حیات ملیّ کا تسلسل قوم کی روایاتِ مخصوصہ کے استحکام کے ساتھ قائم رکھنے پر منحصر ہے۔

☆ اعلائے کلمتہ اللہ (جوع الارض کیلئے جہاد اسلام میں حرام ہے۔)

☆ نصیحت میر نجات نقشبند المعروف بابائے صحرائی بابت مسلمانان ھند

☆ وقت تلوار ہے۔

☆ دُعا

تعارف

فارسی زبان ہندوستان میں مسلمان فاتحین کے ساتھ آئی اور ایرانی فوجیوں اورصوفیوں کے ذریعہ سے برصغیر میں مروّج ہوگئی۔ خلجی، تغلق، لودھی اور مغل بادشاہوں کے دور میں جب مسلمانوں کی سلطنت شمال سے لیکر جنوب تک پھیلی تو فارسی زبان نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ گو اسی زمانے میں اردو زبان بھی وجود میں آئی تاہم فارسی کو علمی اور سماجی اعتبار سے جو فوقیت حاصل رہی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ مرزا غالبؔ جیسا بے مثال اردو شاعر بھی اپنے مجموعۂ اردو کو اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں بے رنگ کہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں انگریزی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ہی ہند ایرانی تعلقات یکسر منقطع ہو گئے اور فارسی کی جگہ انگریزی زبان سرکاری زبان بن گئی۔ لیکن فارسی جو صدیوں سے برصغیر کی سرکاری زبان رہی تھی، اب بھی شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں میں ایک ادبی اور ثقافتی زبان کے طور پر مستعمل رہی۔ علامہ اقبال نے، جیسا کہ انہوں نے ایک جگہ خود ذکر کیا ہے، فارسی زبان کی تحصیل میں کافی محنت کی تھی۔ انہوں نے شعر گوئی کا آغاز اردو زبان میں کیا، تاہم شیخ عبدالقادر کے قول کے مطابق قیامِ انگلستان کے زمانے ہی میں انہوں نے فارسی میں شعر کہنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ اتنی مشق بہم پہنچائی کہ ۱۹۱۲ء کے آس پاس باقاعدہ فارسی زبان کو اپنی تخلیقی کاوشوں کا ذریعہ

بنایا۔ فارسی گوئی میں اقبال کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں اس زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنایا، جب اس زبان کا چلن بر صغیر سے کب کا اٹھ چکا تھا، دوسرے یہ کہ انہوں نے صنف مثنوی کو از سر نو قبول عام سے ہمکنار کیا، خود ایران میں بھی یہ صنف اب متروک ہو چلی تھی۔ اس کے علاوہ علامہ کا یہ بھی ایک اختصاص ہے کہ انہوں نے سبکِ ہندی کی روایت سے منہ موڑ کر سبکِ عراقی اور کسی حد تک سبکِ خراسانی کو اختیار کیا اور اس طرح سے سبکِ ہندی کی ژولیدہ خیال آفرینی سے اپنا دامن بچائے رکھا۔

علامہ نے اپنی فارسی شاعری کی ابتداء مثنوی نگاری سے کی۔ ان کی دو مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ صنفِ مثنوی کا انتخاب انہوں نے غالباً مولانا رومی کے تتبع میں کیا، جن سے علامہ کو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اور جنہیں وہ اپنا مرشد اور راہبر سمجھتے تھے۔ 'اسرار' سے لیکر 'جاوید نامہ' تک علامہ نے کئی جگہ مولانا رومی کے تئیں عقیدت و محبت کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان سے فکری اور روحانی طور پر فیضیاب ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے۔ غرض اقبال کا سارا کلام مولانا کی تجلیل و تمجید سے مملو ہے۔

مثنوی 'اسرار خودی' اس لحاظ سے اقبال کی ایک اہم تصنیف ہے کہ اس میں اقبال کے افکار و تصورات جو ان کی شاعری میں منتشر ہیں، مرتب اور واضح صورت میں بیان ہوئے ہیں۔ خودی کا تصور اگرچہ ان کے کلام میں جا بجا طرح طرح سے بیان ہوا ہے، لیکن جب تک اسرار خودی کا مطالعہ نہ کیا جائے، اس تصور کے حقیقی خدو خال سے واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسرار خودی ہی اقبال کی وہ تصنیف ہے جو آئندہ کیلئے اقبال کی فکر کا رخ متعین کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا مطالعہ اقبال کے ہر قاری اور اقبالیات کے ہر طالب علم کیلئے از بس لازمی ہے۔

موجودہ دور میں فارسی زبان سے ناواقفیت کے باعث اکثر قارئینِ اقبال کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا تسہیلِ کلامِ اقبال کی جانب جو بھی کوشش کی جائے وہ مستحسن ٹھہرے گی۔ چنانچہ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے اس ضمن میں جو قدم اٹھایا ہے، اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ڈاکٹر تسکینہ فاضل کا یہ زیرِ نظر مونوگراف اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ انہوں نے اسرارِ خودی کے مطالب اور اس میں پیش کئے گئے تصورات کی عام فہم زبان میں تفہیم کی جو کاوش کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر تسکینہ نے مثنوی اور اس کے دیباچے کے بارے میں نزاعی امور اور ان کی تفصیلات کو خاصی وضاحت سے بیان کیا ہے اور خاص طور پر اقبال کے جوابات جو انہوں نے مختلف اعتراضات کے بارے میں دئے، ان سے کئی ایسی باتیں شرح وبسط سے بیان ہوئی ہیں، جن کی طرف مثنوی اور اس کے دیباچے میں یا تو محض اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے یا پھر حددرجہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس مونوگراف سے اقبال کے عام قارئین بالعموم اور اقبالیات کے طالب علم بالخصوص بڑی حد تک بہرہ مند ہوں گے۔

پروفیسر محمد امین اندرابی

پیش لفظ

مثنوی اسرار خودی کئی اعتبار سے علامہ اقبال کی اہم تصنیف ہے۔ اوّل تو اس مثنوی کی تصنیف سے اقبال کی فارسی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ اسرار خودی سے پہلے بھی اقبال کے یہاں فارسی گوئی کے کئی نمونے فراہم ہوتے ہیں۔ فارسی گوئی کی طرف اقبال کے میلان کا بنیادی سبب ان کے افکار و خیالات میں وسعت اور رفعت کا پیدا ہونا ہے جسے زبان اردو کی بجائے فارسی زبان ہی مکمل طور سے ادا کرنے کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اقبال نے اس مثنوی کے ذریعے (خاص طور سے موضوع کے لحاظ سے) اپنے وسیع اور گہرے مطالعے، باریک مشاہدے اور تجربے کی گونا گونی کے باعث جو انقلاب برپا کیا، اس کے پیش نظر بعض معترضین کے نزدیک یہ مثنوی کافی عرصے تک اعتراضات کا ہدف بنی رہی، لیکن وقت آنے پر مغربی ممالک کے مقتدر اور سر بر آوردہ علماء اور حکماء کی فکر و نظر کی باریکی اور گہرائی نے اس مثنوی کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کر کے مشرقی ممالک کے علم دوست احباب کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی اور اس مثنوی کی خاطر خواہ پذیرائی کی گئی۔ حالانکہ اقبال نے یہ مثنوی پہلے ہندوستان کے لئے لکھی تھی، اس وقت تک یہ بات ان کے وہم و گمان

میں بھی نہ تھی کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں کو پار کر کے یورپ پہنچ جائے گی۔ اس مثنوی کی مخالفت میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ ان تحریروں نے ایک معرکہ کی شکل اختیار کی جسے معرکۂ اسرار خودی کا نام دیا گیا ہے۔ مثنوی اسرار خودی کی موافقت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ بہر حال اس مثنوی کو اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اقبال نے فلسفۂ خودی کو مربوط اور منظم شکل میں پیش کیا ہے اور بقول سیّد عبد الرشید فاضل ان کی شہرت کو جس فلسفے نے پر پرواز لگائے وہ یہی فلسفۂ خودی ہے۔ چونکہ مثنوی اسرار خودی فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کا بنیادی یا مرکزی موضوع خودی ہے اس لئے اس کی تفہیم میں اقبال کے طالب علموں کو کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ شارحِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو بھی ابتداء میں اس مثنوی کے مطالعے اور پھر اس کی تفہیم میں جن مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا، انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے اقبال سے بھی رجوع کیا تھا، اور اقبال نے انہیں اس کتاب کو رہ رہ کر پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ انہی دقتوں کے پیش نظر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب بشیر احمد نحوی کی جانب سے مجھے اس کتاب پر کچھ لکھنے کیلئے آسان اور سہل پیرائیہ بیان اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ اس ہدایت پر عمل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اسرار خودی کی تفہیم کو اگرچہ کسی حد تک ممکن بنا سکے تو میں یہ سمجھوں گی کی اس کتاب کو لکھنے کا مقصد کسی حد تک پورا ہو گیا۔ اس مثنوی کا اور بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ان علم دوست احباب کی تحریروں پر بڑا تعجب ہو رہا ہے جنہوں نے اقبال کی اس گرانقدر تصنیف کے متعلق وقتاً فوقتاً ایسے منفی اور گمراہ کن خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے اس مثنوی کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ مثلاً اقبال نے اس مثنوی کے ذریعے

جنگ کی تعلیم دی ہے، یا اسرار خودی میں پیش کیے گئے افکار و خیالات مغربی مفکرین کے افکار کی آوازِ بازگشت ہیں۔ یا پھر اس کے ذریعے سے اقبال کو ایک مظلوم قوم کی آزادی کیلئے اشک ریزی کا پہلو دکھانا مقصود ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ مثنوی اسرار خودی کے شدید ردّ عمل میں مثنوی رازِ بے خودی اور ۱۵۵ اشعار پر مشتمل طویل نظم "خطاب بہ اقبال" لکھ کر صفحوں کے صفحے سیاہ کردیئے گئے۔ کس قدر بہتر ہوتا اگر اقبال کی اس گراں قدر تصنیف کو اپنے صحیح سیاق و سباق میں دیکھ کر اس پر معقول انداز میں اور اس کے شایانِ شان اظہار خیال کیا جاتا اور اقبال کو کوئی ہمدم دیرینہ اور ہمراز میسر آکر اطمینان قلب حاصل ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال نے مشرقی فکر کے ساتھ ساتھ مغربی مفکرین کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن یاد رہے کہ انہوں نے مغربی فکر کے فقط انہیں پہلوؤں سے استفادہ کیا ہے جو ان کی فکر کے بنیادی سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے مماثل اور ہم آہنگ ہیں۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال نے اپنے تخلیقی سفر میں ہمیشہ اس تعلیم کو مدِّنظر رکھا ہے کہ حکمت اور دانائی مومن کی گمشدہ چیز ہے اور یہ حکمت اور دانائی انہیں جہاں بھی ملی ہے۔ انہوں نے اسے اس طرح اٹھالیا ہے جیسے یہ ان کی اپنی کوئی چیز ہو۔

جہاں تک مثنوی "اسرارِ خودی" پر دستیاب مواد کا تعلق ہے، اس سلسلے میں وقیع مواد بہت ہی کم فراہم ہوتا ہے، جس میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر نکلسن جیسے اقبالیین کی تحریریں شامل ہیں۔ اسرار خودی کے مختلف زبانوں مثلاً اردو، سندھی، عربی اور انگریزی میں

تراجم کیے گئے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر رینالڈ۔ اے۔ نکلسن نے اسرارِ خودی کا ترجمہ "Secrets of the Self" کے نام سے کیا ہے۔ کتاب میں پروفیسر موصوف کا تحریر کیا ہوا قابلِ قدر دیباچہ بھی درج ہے۔ تراجم کے علاوہ اسرارِ خودی کی کئی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ میں نے اسرارِ خودی کے متن (Text) پر اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی کو اپنی تحریر کی اساس بنایا ہے۔ اقبال پر کام کرنے والا جب متن (Text) سے سرسری گزرتا ہے تو معرکہ اسرارِ خودی تو کیا معرکہ اقبالیات جیسے بڑے اور نہ ختم ہونے والے معرکہ کا وجود میں آنا بھی کوئی غیر ممکن امر نہیں۔ متن (text) کو زیادہ تر نظر انداز کر کے تنقید در تنقید کا جو منفی اور گمراہ کن عمل بعض لکھنے والوں کے یہاں مروّج ہے، اس سے بعض اوقات بلکہ بسا اوقات خطرناک نتائج کے برآمد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی میں اقبال نے جن قرآنی تلمیحات اور اشارات کو برتا ہے، ان سے اس کتاب میں صرفِ نظر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی قرآنی تلمیحات اور اشارات کے موضوع پر پہلے ہی سے ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کی ضخیم کتاب "اقبال اور قرآن" کے علاوہ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کی "مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال" اور اقبال اور قرآن کے عنوان سے کئی مصنفین کی کتابیں دستیاب ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل نہایت کم وقت بلکہ عجلت میں کرنا پڑی جب کہ "اسرارِ خودی" جیسی اہم اور گرانقدر تصنیف پر کچھ لکھنے کیلئے خاصا وقت درکار ہے اور پھر علامہ اقبال کو ایک نابغہ روزگار کی حیثیت حاصل ہے اور ان جیسے نابغہ روزگار

پر مقتدر اہل قلم کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے مقابلے میں میرے یہ چند صفحات اس بڑھیا کی سوت کی انٹی کے مترادف تصور کئے جائیں گے جو نہایت قلیل استعداد پر اپنے جذبۂ بے اختیارِ شوق کے تحت یوسفؑ کی خریداری کیلئے نکلی تھی، چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں کمی یا کوتاہی کا احساس کوئی متعجب بات نہیں۔

غلامِ ھمت آن عارفانِ باکرمیم
کہ یک صواب بہ بینند و صد خطا بخشند

تاہم امید کرتی ہوں کہ اقبالیات کے حلقوں میں اس کتاب کا خیر مقدم کر کے میری حوصلہ افزائی کی جائے گی تا کہ آئندہ بھی اقبال پر مزید کام کرنے کا موقع فراہم ہو سکے۔ میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سابقہ ڈائریکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی، جو موجودہ ایام میں انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں، کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا اپنی سعادت سمجھتی ہوں کہ انہوں نے میری اس کتاب کے متعلق چند صفحات تحریر فرما کر اس کی وقعت میں اضافہ کیا۔

میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائریکٹر جناب بشیر احمد نحوی کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے یہ کام تفویض کیا۔ میں انسٹی ٹیوٹ کے تمام اراکین کی بھی مشکور ہوں۔ آخر میں اپنے شوہر میر محمد زمان کی تہہ دل سے سپاس گذار ہوں جن کے بے پناہ تعاون اور حوصلے کی بدولت یہ کتاب مکمل ہو پائی۔ کیونکہ تصنیف کے کام میں بالخصوص ایک خاتون کو جب تک اس کے شوہر کا تعاون شاملِ حال نہ ہو، تب تک گھر کے علائق سے فرصت پا کر ایسا کوئی کام کرنا ممکن نہیں۔

تسکینہ فاضِل
سرینگر
۲۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

فارسی گوئی کی طرف اقبال کا میلانِ طبع

اسباب و محرکات

مثنوی اسرارِ خودی کو موضوع بحث بنانے سے پہلے مذکورہ مثنوی کے حوالے سے دو اساسی نکتوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ اردو سے فارسی کی طرف اقبال کے میلان یا Diversion کے اسباب۔ اور دوئم یہ کہ اس مثنوی کیلئے بالخصوص خودی ہی کا موضوع منتخب کرنے کا سبب۔ (موخرالذکر نکتے کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی)۔ جہاں تک پہلے نکتہ کا تعلق ہے، اردو زبان میں بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جیسی وقیع اور گرانقدر تصانیف کی اشاعت کے باوجود اقبال کو دقیق خیالات کے اظہار اور وسعت بیان کی خاطر اردو کے تنگنائے سے نکل کر فارسی زبان کے Medium کو اختیار کرنا پڑا۔ اقبال کے شعری مذاق میں اس تغیّر کے وقوع پذیر ہونے کے پس پشت کئی عوامل کارفرما بتائے جاتے ہیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تصوّف پر کتاب لکھنے کیلئے اقبال نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا اور علم فلسفہ کے متعلق جیسے جیسے ان کے علم میں وسعت اور گہرائی آتی گئی، اسی قدر انہیں اندازہ ہوا کہ اردو کے مقابلے میں فارسی کا سرمایہ کہیں زیادہ دقیع ہے۔ "اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو

میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں"[1] ظاہر ہے یہ تغیر کوئی وقتی یا اضطراری تغیر نہ تھا بلکہ اسے اقبال کے تخلیقی سفر میں ایک نہایت ہی سنجیدہ اور معنی خیز تغیّر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ "اسرار خودی" سے لیکر کے "ارمغانِ حجاز" تک اقبال کا تمام تر شعری سفر فارسی زبان ہی میں جاری رہا۔ یہ ضرور ہے کہ اس سفر کے دوران وہ اردو میں بھی لکھتے رہے تاہم ان کا طبعی میلان اب زیادہ تر فارسی ہی کی طرف رہا، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب فارسی ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی اور ان کے قلب وذہن کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔

اقبال کی فارسی گوئی کی ابتداء کے پسِ پشت ایک چھوٹا سا واقعہ کارفرما بتایا گیا ہے۔ "بانگِ درا" کے دیباچہ کی (جسے مدیر مخزن شیخ سر عبدالقادر نے تحریر کیا ہے) رُو سے ایک مرتبہ اقبال کو اپنے ایک دوست نے مدعو کیا تھا جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش کی گئی اور ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا وہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں؟ اس پر اقبال نے بتایا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس فرمائش نے اقبال کے دل میں فارسی میں شعر کہنے کی ایسی تحریک پیدا کر دی کہ "دعوت سے واپس آخر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا، جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا"[2]۔ شیخ عبدالقادر نے دیباچہ بانگِ درا میں اقبال کی فارسی گوئی کے

۱۔ کلیاتِ اقبال۔ شیخ عبدالقادر۔ ص ۱۶

۲۔ کلیاتِ اقبال۔ شیخ عبدالقادر۔ ص ۱۶

آغاز کے حوالے سے جو واقعہ رقم فرمایا ہے، اس کی رُو سے اقبال کے اس سے قبل محض ایک آدھ شعر فارسی میں کہنے کی بات کا جہاں تک تعلق ہے اسے اقبال کی کسر نفسی اور تکلف پر محمول کیا جانا چاہیئے۔ اصولِ انتقاد کی رو سے فن کار کے اپنے فن اور شخصیت سے متعلق دیئے گئے بیانات کا تحقیقی بنیادوں پر تجزیہ کرنا ناگزیر ہے، بعض اوقات بلکہ بسا اوقات صرف فنکار کے بیانات پر اکتفا کرنے سے غلط نتائج کے بر آمد ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ بہر حال لندن روانہ ہونے سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء تک اقبال نے خاصی تعداد میں فارسی اشعار کہے تھے۔ ڈاکٹر محمد ریاض (اقبال اور فارسی شعراء کے مصنف) باقیات اقبال طبع ثانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس وقت تک ان کے کہے ہوئے اشعار میں سے کم از کم ایک سو ہنوز محفوظ ہیں۔ اگرچہ اقبال کے یہ فارسی اشعار کسی مجموعے میں شامل نہیں تاہم اس سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت پہلے بلکہ عنفوان شباب ہی میں فارسی اشعار کہنے شروع کئے تھے بلکہ ان کی بعض اردو نظموں میں بھی کہیں کہیں فارسی کے اشعار در آئے ہیں۔ اس بیان کے ثبوت میں ذیل میں ان کی دو[2] اردو نظموں فریاد امت اور نالۂ یتیم (۱۸۹۹) سے ماخوذ فارسی کے یہ دو[2] اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

خندۂ صبح تمنائے براہیم استی
چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم استی

(فریادِ اُمت)

دوستی از کس نمی بینیم یاران راچہ شد
دوستی کو آخر آمد دوستداران راچہ شد

(نالۂ یتیم)

۱۹۰۲ء میں کہی گئی نظم بعنوان "شکریۂ انگشتری" میں سولہ فارسی اشعار بھی درج ہیں۔ یہاں پر صرف ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

یارم از کشمر فرستاد است چار انگشتری
چار در صورت بمعنی صد ہزار انگشتری

مخزن کے ۱۹۰۵ء کے جنوری کے شمارے میں اقبال کی ایک مکمل فارسی نظم ملتی ہے۔ جس پر مدیر نے اپنے تعارفی کلمات بھی تحریر کیے ہیں[۱] "سپاس جناب امیرؒ" کے زیر عنوان یہ نظم ۳۴، اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ "باقیات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد معینی میں اقبال نے کئی فارسی شعراء کے مصرعے اور اشعار درج کیے ہیں۔ مثلاً قدسی کا شعر۔

مرحبا سیدِ مکّی مدنی العربی　　دل وجان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اقبال کے ان مذکورہ بالا فارسی اشعار کا حوالہ دینے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبال کے انگلستان جانے سے قبل ان کی فارسی گوئی کا آغاز ہو چکا تھا (ہاں البتہ ان کی فارسی گوئی نے باقاعدہ صورت اسرار خودی کی تصنیف سے ہی اختیار کی)۔ ان کے یہ فارسی اشعار اور نظمیں فارسی کے اسلوب شعر پر ان کی دسترس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان میں قیام کے دوران بھی اقبال کی فارسی گوئی کے بعض نمونے فراہم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء کو ٹرنٹی کالج کیمبرج سے اقبال نے عطیہ فیضی کو لندن میں اپنی ایک فارسی

۱۔ "ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم ان احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کیلئے اکثر دفعہ اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً "مخزن" میں درج نہیں ہوتیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں"
سیّد عبدالواحد معینی (مرتب) باقیاتِ اقبال۔ ص ۱۹۲۔

غزل بھیج دی تھی جو اقبال کے ہاتھ کی تحریر کردہ ہے۔ اس غزل کا عکس تحریر عطیہ فیضی کی اقبال پر لکھی ہوئی کتاب میں موجود ہے۔ یہ غزل اس طرح تھی۔

اے گل زخارِ آرزو آزاد چوں رسیدہ ای
ہم تو زِ خاک این چمن مانندِ ما دمیدہ ای

اقبال ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے لوٹے۔ انگلستان سے لوٹنے کے بعد ان کا میلانِ طبع فارسی کی طرف ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دوران انہوں نے چند شاہکار اردو نظمیں بھی تخلیق کیں، لیکن طبیعت کا میلان زیادہ تر فارسی کی طرف ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸ جنوری 1915ء کے اپنے ایک قریبی دوست غلام قادر گرامی (جو خود بھی فارسی کے ایک بڑے شاعر ہیں) کے نام لکھے گئے ایک مکتوب میں فارسی کی طرف اپنے بڑھتے ہوئے میلان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں، فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ کہ دل کا بخار اردو میں نکال نہیں سکتا"[۱]

اقبال نے فارسی زبان کو اس لئے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا کیونکہ یہ زبان ان کے افکار و خیالات کی رفعت کو پیش کرنے کے سلسلے میں اردو کے مقابلے میں زیادہ موزون اور ہم آہنگ تھی۔ انہوں نے اپنا فلسفۂ حیات پیش کرنے کیلئے زبانِ فارسی کے انتخاب کا سبب خود ہی ذیل کے اشعار میں بیان کر کے اس زبان کی شیرینی اور بلند افکار کے بیان کی اہلیت کا ذکر کیا ہے۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتارِ دری شیرین تر است

۱۔ محمد عبداللہ قریشی، (مرتب) مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۹۹

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خانۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعت اندیشۂ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام
خردہ برمینا مگیر ای ہوشمند
دل بذوقِ خردہ ی مینا بہ بند

مرور ایام کے ساتھ اقبال کے دل و دماغ میں فارسی زبان اس قدر رچ بس گئی تھی کہ اب ان پر شعر وارد ہی فارسی زبان میں ہونے لگے تھے۔ اقبال کی فارسی گوئی کے متعلق عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ انہوں نے فارسی زبان اس لئے اختیار کی تاکہ ان کے خیالات وسیع حلقے میں پہنچ جائیں لیکن اقبال نے اس کی تردید کی ہے۔ اس طرح اردو کی بجائے فارسی میں اقبال کی شعر گوئی کی شروعات کے متعلق مختلف اصحاب نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ اقبال گول میز کانفرنس کے دوران جب وہ لندن میں مقیم تھے۔ اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے ان کے اعزاز میں ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو ایک عظیم الشان چائے پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں گول میز کانفرنس کے تقریباً تمام مندوبین کے علاوہ کئی اہل علم و دانش نے بھی شرکت کی تھی۔ اس دعوت میں کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر اور ''اسرارِ خودی'' کے مترجم رینالڈ۔ اے۔ نکلسن نے اقبال کی شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اقبال نے بھی ایک تقریر کی تھی، جس میں اپنی فارسی گوئی کی نسبت انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتادوں کہ میں نے کیوں فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کئے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ

فارسی زبان میں نے اس لئے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل بر عکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی اسرار خودی ابتداء میں صرف ہندوستان کے لئے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا"۔[۱]

اقبال کی فارسی دانی پر لوگ بڑے متعجب ہوئے کہ انہیں فارسی کیونکر آ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے اسکول اور کالج کی طالب علمی کے ایام کے دوران فارسی باقاعدہ طور پر بحیثیت ایک مضمون (As a Subject) نہیں پڑھی تھی تاہم انہیں بچپن سے اس زبان کے ساتھ غیر معمولی شغف تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے استاد مولوی سیّد میر حسن سے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی بھی پڑھی تھی۔ اس کے علاوہ اقبال فارسی اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ بھی کرتے رہے ہیں۔ اس طرح ان کا فارسی کے اساتذہ سے اکتساب فیض کرنا قیاس سے باہر کی بات نہیں۔ چنانچہ خود اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیوں کر آ گئی جب کہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کیلئے اسکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے

۱۔ محمد حمزہ فاروقی۔ سفر نامہ اقبال۔ (۱۹۷۳ء) ص۔ ۷۰۔۷۱

اساتذہ سے استفادہ کیا![1]

اسرار خودی کے ماتھے کا جھومر۔ مولانا رومی کا ایک قطعہ

دی شیخ با چراغ ھمی گشت گرد شہر
کزدام و دد ملولم و انسانم آرزو ست
زین ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستمِ دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود، جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست[2]

(مولانا رومؔ)

اسرار خودی اور رموز بے خودی جب ایک ساتھ شائع ہوئی تو علامہ اقبال نے مولانا روم کے مذکورہ بالا تین غزلیہ اشعار سے اس کا آغاز کیا۔ اسرار خودی کے پہلے دو ایڈیشنوں میں مولانا روم کے یہ اشعار نہیں ملتے۔ اقبال نے اپنے مرشد روحانی مولانا جلال الدین رومؔی کی ایک طویل غزل کے ان تین

۱۔ شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ اوّل۔ ص۔ ۳۴۳

2. Yesterday, the master with a lantern, was raoming about the city saying, " I am tired of devil and beast, I want a man, I desire the lion of God and Rustam son of Zal" they said, He is not to be found, we have sought him long". He said. A thing that is not to be found-that is what I desire."

سید عبدالرشید فاضل رومی کے ان اشعار کا منظوم ترجمہ اس طرح کرتے ہیں

کل شہر میں چراغ لئے پھر رہا تھا شیخ
کہتا تھا ناکسوں میں اک انسان کی ہے تلاش
دل بجھ گیا ہے ست رفیقان راہ سے
شیر خدا و رستم دستان کی ہے تلاش
میں نے کہا کہ ڈھونڈ کے ہم تھک گئے اسے
کہنے لگا کہ ایسے ہی انسان کی ہے تلاش

اشعار کا انتخاب کر کے مثنوی اسرار خودی کا آغاز کیا اور انہیں اس مثنوی کا فاتحۃ الکتاب بنایا ہے۔ ان اشعار میں مولانا روم کو شیر خدا اور رستم دستانم یعنی ایک نصب العینی آدم کی تلاش ہے۔ اقبال بھی ایسے ہی آئیڈیل انسان کی تعمیر و تخلیق کیلئے مدت العمر کوشاں رہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی انسان کو خود بین، خدا بین اور جہاں بین بنانے کیلئے وقف کر دی اور فلسفہ خودی کے ذریعے انسان کو اس کی انسانیت کی معراج پر پہنچانے کیلئے سعیِ پیہم کرتے رہے۔ مولانا روم کے مذکورہ بالا اشعار کو مثنوی اسرار خودی کے آغاز کیلئے منتخب کرنے کا سبب یہ ہے کہ اقبال مولانا روم سے گہری فکری ہم آہنگی رکھتے تھے اور دونوں کی طبیعتیں اس معاملے میں بڑی حد تک ہم رنگ تھیں۔ بہ الفاظ دیگر اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کو مولانا روم کے مذکورہ بالا اشعار کی تفسیر کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ مولانا کے ان اشعار کے انتخاب سے اقبال کے فلسفہ حیات کی نشاندہی ہوتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبدالشکور احسن اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"رومی ایک مثالی انسان کی جستجو میں ہیں جو روحانی اور جسمانی قوت کا پیکر اور ان کے امتزاج کا مظہر ہے۔ یہ انسان گردو پیش میں نہیں ملتا تو نہ سہی مگر شاعر کے ذوق و جستجو نے اس مثالی پیکر کو حقیقت کا روپ دینے کیلئے بے قرار کر رکھا ہے۔ ان اشعار سے کتاب کا آغاز خود علامہ کے فلسفہ حیات کی نشاندہی وضاحت سے کر رہا ہے۔ وہ زندگی میں جس قوت اور عظمت کے طالب ہیں اس کا احساس رومی کے ان اشعار میں پوری شدت سے موجزن ہے"[1]

اقبال مولانا رومی کے ان اشعار سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ اسرار خودی کے علاوہ جاوید نامہ میں بھی یہی اشعار صورت بدل کر در آئے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص ۲۲

دراصل جو اشعار یا خیال ایک مرتبہ فن کار کے قلب و ذہن کو چھو جائے وہ اس کے تخلیقی سفر میں رہ رہ کر مختلف شکلیں بدل بدل کر اظہار کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ جاوید نامہ کا آخری منظر یہ ہے۔

آتش استی بزمِ عالم بر فروز
دیگراں را ہم بسوز و خود بسوز
نالہ را اندازِ نو ایجاد کن
بزم را از ہائے وہو آباد کن
آشنائے لذتِ گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو

رفیق خاور اپنی کتاب "اقبال کا فارسی کلام ---- ایک مطالعہ" میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری کے مواقع سیار، چرخ زن بادلوں کی طرح بار بار گھوم گھوم کر آتے ہیں اور خود کو دہراتے رہتے ہیں۔ "اسرارِ خودی" کا....... ابتدائی منظر "جاوید نامہ" کا آخری منظر بھی ہے اور ھو الاول ھو الآخر کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ جو اثر یا خیال ایک دفعہ ذہن پر محیط ہو جائے بار بار لوٹ کر آتا ہے اور نئی نئی صورتوں میں سر ابھارتا ہے۔[۱]

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ان کے والد علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ ان کے برہمن اجداد اپنی زندگیاں خدا کی تلاش میں گزارتے رہے اس کے برعکس میرے والد علامہ اقبال نے اپنی حیات انسان کی تلاش میں بسر کی۔ لیکن یہ انسان کوئی عام انسان نہیں بلکہ انہیں ایک آئیڈیل

۲۔ رفیق خاور۔ اقبال کا فارسی کلام۔ ایک مطالعہ۔ ص۔ ۱۷

انسان کی تلاش تھی اور اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ اس آئیڈیل انسان کی تخلیق و تعمیر کیلئے نصب العین پیش کرتا ہے۔ اس نصب العینی آدم کے تصور کے پسِ پشت قرآن حکیم کے عظمتِ آدم کا تصور کار فرما ہے۔ قرآن حکیم کے عظمت آدم کے تصور کے علاوہ اقبال کے مذکورہ تصور پر جرمن مفکر نطشے کے فوق البشر (جزوی طور پر) مولانا رومی اور عبدالکریم الجیلی کے "الانسان الکامل" کے اثرات مرتسم ہیں۔

ان اثرات کی توضیح و تفصیل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے علاوہ کئی دوسرے دانشوروں نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہے جو اس ضمن میں اسرار خودی کے حوالے سے سپرد قلم کی جاچکی ہیں۔ اب جہاں تک مولانا روم کے مذکورہ بالا تین اشعار جنہیں اقبال نے مثنوی اسرار خودی کا فاتحۃ الکتاب بنایا ہے۔ اس میں مولانا روم نے دیو جانس کلبی کا وہ مشہور قصہ بیان کیا ہے جس کی رُو سے وہ دن دھاڑے چراغ لیکر "آدمی" کی تلاش کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنے مضمون رومی، نطشے اور اقبال میں اس قصے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"وہ (دیو جانس کلبی) دن میں چراغ لیکر منڈی میں پھر رہا تھا۔ اپنی قوم اسے ایک سنکی حکیم سمجھتی تھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت دن دھاڑے چراغ لیکر کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہنے لگا۔ آدمی کو ڈھونڈتا ہوں۔ جب اس سے کہا گیا کہ آدمیوں کا ہجوم تمہیں نظر نہیں آتا؟ تو اس نے جواب دیا۔ کہ یہ سب ادنیٰ درجے کی مخلوق ہے۔ انسان ان میں ایک بھی نہیں۔ یہی شیخ دیو جانس ہیں۔ جن کا فلسفہ اس قصے کے پیرائے میں مولانا روم نے ان اشعار میں لکھا ہے، جو اقبال کو اس قدر پسند تھے کہ انہیں اپنی کتاب کے سرورق پر درج کیا ہے" [1]

۱۔ پروفیسر اے، جی، نیازی۔ (مرتب) اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص ۸۵۔۸۶

پیشکش بحضورِ سر سید علی امام

اقبال نے اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن سر سید علی امام[1] بیرسٹرایٹ لا کے نام معنون کیا تھا۔ موصوف مِلّت اسلامیہ کے ایک جلیل القدر فرزند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے سیاست دان اور قانون دان تھے۔ علی امام اسلامی اخلاق و آداب کا ایک جیتا جاگتا پیکر تھے۔ وہ گفتگو کے دوران قرآنی آیات، عربی قصائد کے اشعار اور فارسی محاورات کا کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ اقبال علی امام کی جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر تھے، وہ ہے نبی محترم ﷺ کے تئیں ان کی بے پناہ عقیدت اور والہانہ عشق۔ محمد عبداللہ قریشی "مکاتیب اقبال بنام گرامی" میں گفتار اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے "ملوجا" جہاز میں اقبال ان کے ہم سفر تھے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں جو اسی جہاز سے کسی

۱۔ "وہ پہلے مسلمان تھے جو وائسرائے ہند کی مجلس انتظامیہ کے رکن نامزد ہوئے اور پہلے ہندوستانی تھے جو ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے جینوا کی لیگ آف نیشنز میں شرکت کیلئے بھیجے گئے۔ اگست ۱۹۱۹ء میں حضور نظام نے طلب کر کے صدر المہام مقرر کیا جو اب حکومت کے قیام کے بعد مدار المہام کے منصب کا نیا نام تجویز ہوا تھا۔ یہاں انہوں نے ریاست کی ترقی کیلئے کئی منصوبے تیار کئے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گئے ہوئے تھے کہ بیمار ہو کر واپس چلے آئے اور ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال فرما گئے" محمد عبداللہ قریشی۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۰۳

دوست کے نام لکھا گیا۔ اقبال فرماتے ہیں: "سید علی امام صاحب۔ ایک روز صبح کے وقت عرشۂ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے۔ دیکھو بھائی اقبال! اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا، کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت لی۔ ان کی آنکھ نمناک ہو گئی اور بے اختیار ہو کر بولے بلغ سلامی روضته فیها النبی المحترم ان کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا"[1]

مثنوی اسرار خودی کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کی صرف ۵۰۰ کاپیاں شائع کی گئی تھیں۔ اس ایڈیشن میں اقبال کا لکھا ہوا دیباچہ اور خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق ۳۵ اشعار درج ہیں جنہیں بعد کے ایڈیشنوں سے اقبال نے مصلحت کے تحت خارج کر دیا۔ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں دیباچے کے بعد ۱۹۔ اشعار پر مشتمل ایک عنوان "پیشکش بحضور سر سید علی امام مد ظلہ" قائم کیا گیا ہے[2] اور جب اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو ان ۱۹۔ اشعار میں سے گیارہ اشعار کو حذف کر کے اس عنوان کو فقط آٹھ اشعار پر مشتمل رہنے دیا گیا۔ ان گیارہ اشعار کو حذف کر دینے سے پیشکش میں جامعیت اور تناسب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حذف شدہ گیارہ اشعار میں اقبال نے شاعرانہ تعلّی کا اظہار کیا تھا۔ ان اشعار کو اقبال نے دوسرے ایڈیشن سے الگ تو کیا لیکن بعد میں یہی اشعار اسرار خودی کے ایک اور عنوان "تمہید" میں جگہ پا گئے اور تمہید میں

۱۔ محمد عبداللہ قریشی (مرتب) مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۰۳۔ ۱۰۴

۲۔ یہ اشعار باقیات اقبال۔ مرتب سید عبدالواحد معینی کی رُو سے اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں بطریق انتساب درج تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں انتساب کو حذف کر دیا (گیا) مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔ (گئی)

شامل کیے گئے ان اشعار سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے یہ اسی تمہید ہی کے اشعار ہوں اور ان سے علیحدہ یا مختلف کوئی چیز نہ ہوں۔ آٹھ اشعار پر مشتمل یہ انتساب اپنی موزونیت اور چستی کا بخوبی احساس دلاتا ہے۔ بہر حال انتساب سے یہ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

اے امام! اے سیّد والا نسب
دود مانت فخر اشراف عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقلِ کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بیگانۂ
جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ
مرغِ فکرم گلستانہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است
ایں گل از تارِ رگِ جان بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام
ملت از جسم است شاعر چشم اوست
جسم را از چشمِ بینا آبرو ست
چشم از نورِ محبت روشنم
اشکبار از دردِ اعضائے تنم
نذرِ اشکِ بیقرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

یہ آٹھ اشعار بھی دوسرے ایڈیشن کے بعد مطلق طور پر حذف ہو گئے۔

اسرارِ خودی کی تمہید

اقبال نے اسرارِ خودی کی تمہید کی ابتداء میں فارسی کے معروف شاعر نظیری نیشاپوری کا ایک شعر درج کیا ہے۔ اس شعر کو درج کرنے سے تمہید کے خلاصے کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔ شعر یوں ہے۔

نیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

شارحِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس شعر کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میرے صحرا میں اگرچہ خشک اور تر دونوں قسم کے درخت پائے جاتے ہیں لیکن ان میں کوئی درخت بیکار نہیں ہے۔ مثلاً جس درخت کی لکڑی سے منبر نہیں بن سکتا اس سے دار بنا سکتے ہیں۔ اقبال نے اس شعر کے پردے میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ میں نے اپنے کلام میں یا اس مثنوی میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کار آمد ہے اور مفید مطلب ہے۔ کوئی بات بیکار نہیں لکھی ہے"[1]

علامہ نے اسرار خودی کی تمہید باندھنے کیلئے نظیری نیشاپوری کے جس شعر کو حُسنِ آغاز بنایا ہے اس میں برتے گئے دو لفظ اقبال کے موضوعات شعری

۱۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ شرح اسرار خودی۔ ص ۲۲۹

میں خاص علامتوں کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ اوّل منبر دوم دار یا چلیپا۔ اس شعر میں اس طنزیہ اظہار کی نشاندہی کی گئی ہے جو منصور کے حوالے سے پھانسی کے پھندے یا دار کو علم و عرفان کی علامت اور منبر کو فضل فروشوں کی عصبیت اور جہالت کی علامت بناتا ہے۔ مثلاً ایسے اشعار میں ؎

رقابت علم و عرفان سے غلط بنی ہے منبر کی
کہ وہ منصور کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا[1]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے نزدیک "منبر سے مقام اعلانِ حق مراد ہے، دار سے مقام ابطال باطل مراد ہے۔ یعنی اگرچہ اس مثنوی سے حق کا اثبات مقصود ہے لیکن اگر کسی شعر سے حق کا اثبات نہیں ہو گا تو کم از کم کسی باطل عقیدہ کا ابطال ہو جائے گا۔[2]

اقبال اپنی بیاض "Stray Reflections" میں نظیرؔی کے مذکورہ بالا شعر کے بے بہا ہونے کی نسبت لکھتے ہیں۔

" I would not exchange for half a dozen systems of philosophy this one verse of Naziri [3]"

اسی نظیرؔی کے ایک اور مصرعے کے عوض اقبال ملک جم تک قبول کرنے کیلئے تیار نہیں

بملک جم ندھم مصرعہ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

بہر حال نظیرؔی کا مذکورہ بالا شعر جسے اقبال نے "اسرار خودی" کی تمہید

ا۔ بعض کتابوں میں مصرعہ ثانی یوں درج ہے کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

۲۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ شرح اسرار خودی۔ ص ۲۲۹

3 Dr. Javid Iqbal (Editor) Stray Reflections. p. 140.

کیلئے منتخب کیا ہے، فارسی اساتذہ کے ساتھ اقبال کی گہری عقیدت پر دال ہے۔ اقبال اپنے آپ کو ایک ایسے خورشیدِ نوزائیدہ سے مشابہ کرتے ہیں جس نے ابھی اس دنیا کے رسم و آئین فلک کا مشاہدہ ہی نہ کیا ہو اور جو اپنی نمود کے خوف سے لرزہ بر اندام ہے۔ اقبال اپنے آپ کو ایک ایسے نغمے سے تعبیر کرتے ہیں جو مضراب سے بے نیاز ہو اور آنے والے شاعر کی نوا ہو۔ وہ اپنے قدیم احباب سے مایوس اور نا اُمید نہیں کیونکہ ان کا طور حکیم کے دیدار کا خواہاں ہے۔ ان کے نزدیک احباب کا قلزم بے خروش ہے جب کہ وہ خود شبنم بحرِ بیکراں کی مانند طوفان بدوش ہے۔ اس کا نغمہ کسی دوسرے جہاں کا ہے۔ کتنے ہی ایسے شعراء ہیں جو خود تو گزر گئے لیکن ہماری آنکھوں کو دیدۂ بینا کی حیثیت عطا کر گئے۔

رخت باز از نیستی بیرون کشید
چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید
کاروانہا گرچہ زین صحرا گزشت
مثل گام ناقہ کم غوغا گذشت

اقبال "ضربِ کلیم" میں عجمی لَے کو قوم کے حق میں کسی بھی صورت میں مستحسن قرار نہیں دیتے اور اپنے مرحلۂ شوق کے طے نہ ہونے کے متمنی ہیں۔ اسی مجموعے کی نظم بعنوان "شعرِ عجم" میں ایرانی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اسے مسلمانوں کے قوتِ عمل کو مفلوج کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس سے پہلے "بانگِ درا" میں شامل "شاعر" کے عنوان سے اپنی دو نظموں میں بھی شاعر کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پہلی نظم کی رُو سے شاعر دن کی شورش سے فرار حاصل کر کے عزلت شب میں اشک ریز ہو کر فریاد کرنا چاہتا ہے لیکن فریاد کرے تو کس سے کرے۔ اس کی محفل شمعِ لحد کی مانند مردہ ہے

جب کہ شاعر کی منزل بہت دور ہے۔ "شاعر" ہی کے عنوان سے "بانگِ درا" کی دوسری نظم میں اقبال گلشنِ دہر کیلیئے جوئے مئے سخن کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسانی جذبات کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں جن میں سے ایک شعر بھی ہے۔ وہ شعر کے تخلیقی یا ایقاظی اثر کیلیئے نہ صرف اس کے معانی و مطالب بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صورت اور طرز ادا کی دخل اندازی کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک قوّت و شوکت کا پیام دینے والی اور قوم کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنیوالی شاعری صحیح شاعری ہے۔ "جاوید نامہ" میں شاعر کو ملّت کے سینے کے اندر دل کی حیثیت عطا کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ ملّت جس کا کوئی شاعر نہ ہو، مٹّی کا ایک انبار ہے، یہاں شاعر کو وارثِ پیغمبری سے تعبیر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اے بسا شاعر کہ از سحر ہند
رہزنِ قلبِ و ست و ابلیس نظر
شاعر ہندی خدا لیش یار باد
جانِ او بے لذتِ گفتار باد
شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل
ملّتے بے شاعرے انبار گل
سوز و مستی نقشبند عالمے است
شاعرِ بے سوز و مستی ماتمے ست
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اقبال فن کی افادیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک صحیح آرٹ وہ

ہے جس سے جوش ولولہ اور عمل کی تحریک ملے اور انسان کے خیالات میں انقلاب بپا ہو۔

اقبال نے قوم کو نئے اسرار حیات کی آگہی کا پیغام دینے کی بات جس مخصوص منفرد اور بلند آہنگ لہجے میں کی ہے۔اس کے پیش نظر انہوں نے اپنے آپ کو شاعرِ فردا قرار دیا ہے۔

نغمہ ام،از زخمہ بی پرواستم
من نوائے شاعرِ فردا ستم
ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ماکشاد
چشمہ ی حیوان براتم کردہ اند
محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند
ذرہ از سوز نوایم زندہ گشت
پر کشود و کرمک تابندہ گشت

اقبال کے ان اشعار میں ان کے پیشرو شعراء کے اشعار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مثلاً غالب کا یہ شعر۔

ہوں گرمئی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

یا غنی کا یہ شعر۔

نگردو شعر من مشہور تاجاں در تنم باشد
کہ بعد از مرگِ آہو نافہ بیروں مے دہد بورا

اسرار خودی کی تمہید میں شاعر اپنے آپ کو محرمِ راز قرار دیتا ہے۔ ذرّہ بھی اس کی سوز نوا سے زندہ ہو جاتا ہے۔ شاعر عیش جاوداں کے اسرار جاننے اور ارض وسماء میں اس کے افکار کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ پیر گردوں نے اس پر زندگی کے اسرار فاش کیئے ہیں۔ اس لئے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے کسی بات کو مخفی رکھنے کی تاب کیونکر لا سکتا ہے۔ اس دعوت کے بعد وہ ساقی سے مخاطب ہو کر اس کے جام کو بھر دینے کا آرزو مند نظر آتا ہے۔ جس کے فیض سے ناکام و نامراد بھی کامیابی اور سر خروئی کی منزل سے ہمکنار ہو جاتے ہیں، جو بھولے بھٹکے ہوؤں کو اپنی منزلِ مقصود کی اور رہنمائی کرتے ہیں۔ اقبال پیر روم سے اکتساب فیض کرنے کے آرزو مند ہیں کیونکہ فطرت نے انہیں عشق کی دولتِ بے بہا سے مالا مال فرمایا ہے۔ جب کہ ۔

من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

ایک شب شاعر کا دلِ اندوہگیں فریاد کرنے پر مائل نظر آتا ہے اور وہ بے مہریٔ دوراں کا شکوہ کر رہا تھا۔ غور و فکر کرتے کرتے اس پر اس قدر اضمحلال کی کیفیت طاری ہو گئی جیسے اس کے بال و پر شکستہ ہو چکے ہوں۔ اسی اثناء میں اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ محوِ خواب ہو گیا۔ اتنے میں پیر رومی نے خواب میں آخر اقبال کو مہر خامشی توڑ دینے کا مشورہ دیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کرنے پر یوں ابھارا!

تابکی چوں غنچہ می باشی خموش
نکہت خود را چو گل ارزاں فروش
در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند
محمل خود برسر آتش بہ بند

چوں جرس آخر ز ہر جزو بدن
نالہ ی خاموش را بیرون فگن
آتش استی بزم عالم بر فروز
دیگراں را ہم ز سوز خود بسوز
فاش گو اسرارِ پیر می فروش
موج می شو کسوت مینا بپوش

پیر رومی علامہ اقبال کو اپنے نالوں کیلئے اندازِ نو ایجاد کرنے اور بزم کو تازہ ہائے وہو سے آباد کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ قم کا ایک نعرہ بلند کر کے زندوں میں جانِ تازہ عطا کردے۔ تاکہ ان میں اپنی زندگی کے احساسات پیدا ہوں اور ؎

آشنائے لذتِ گفتار شو　　ای درای کارواں بیدار شو

پیر رومی کے اس پیغام سے اقبال کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ یہ پیغام ان کے دل میں ایک نیا ولولہ اور ہیجان پیدا کر دیتا ہے اور علامہ رازِ خودی کو آشنا کرنے اور اس کے اعجاز کو منکشف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال پیر رومی سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میرے زندگی ایک نقش ناتمام کی حیثیت رکھتی تھی لیکن عشق کی صیقلگری نے مجھے حقیقی معنوں میں آدم بنا دیا۔ اقبال نے اپنی ملّت کی خاطر کتنے ہی آنسو بہائے ہیں تب جا کر کے وہ رازِ حیات کے پردے کو چاک کرنے کے اہل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ملّتِ بیضا کی خاک پا قرار دیکر کہتے ہیں کہ یہ وہ ملّت ہے جس کا شہرہ ہمارے قیاس کے احاطے سے باہر ہے ؎

آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم　　گرچہ دودم از تبار آتشم

خامہ ام از ھمتِ فکرِ بلند　　رازایں نہ پردہ در صحرا فکند
قطرہ تا ھمپایہ دریا شود　　ذرہ از بالیدگی صحرا شود

تمہید کے آخری بند میں علامہ نے از راہِ کسر نفسی یا تکلف زبان فارسی سے ناآشنا ہونے اور اصل میں اپنے ہندی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس سخن گوئی سے ان کا مقصود شاعری نہیں، چنانچہ وہ قارئین سے کہتے ہیں کہ مجھ سے حسنِ بیان کی توقع نہ کی جائے۔ اس زبان کے حسن نے اقبال کی فکرِ رسا کو مسحور کر کے رکھ دیا ہے اور نخل طور پر ان کا خامہ شاخ بن گیا ہے۔ چونکہ قدرت نے انہیں ذہنِ رسا اور رفعتِ فکر کی دولت سے سرفراز کیا ہے۔ اسی سبب کے تحت انہیں زبان فارسی پسند خاطر ہوئی اور فارسی کی اس شرابِ ناب سے بہرہ ور ہونے کیلئے کہا گیا ہے۔

خردہ برمینا مگیر ای ہوشمند
دل بذوق خردہ ی مینا بہ بند

مثنوی اسرار خودی کی تمہید لکھنے میں اقبال نے ظہوری ترشیزی کے معروف ساقی نامے کی پیروی کا اعتراف کیا ہے۔

اقبال کے افکار و خیالات سے مغربی دنیا اس وقت روشناس ہوئی جب کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر آر۔اے نکلسن کا اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ "Secrets of the self" کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا، تو مغرب میں اقبال کے افکار و خیالات پر مخالف اور موافق دونوں قسم کی آراء پیش کی گئیں۔ جیسا کہ سیّد مظفر حسین برنی کلیات مکاتیب اقبال کی جلد دوم کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"اسرار خودی کی طباعت (۱۹۱۵ء) کے بعد اقبال کے فلسفہ خودی کی

مخالفت اور موافقت میں بحث شروع ہو گئی اور عرصہ تک چلتی رہی۔ جب انگریزی نقادوں نے انسان کامل، خدا اور الوہیت اور فلسفہ سخت کوشی پر تنقید کی تو علامہ نے اپنے مکتوب محررہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۷ء بنام ڈاکٹر نکلسن (مترجم اسرار خودی) میں ان موضوعات پر مفصل بحث کی ہے۔ یہ خط علامہ کی شاعری اور فلسفہ کو سمجھنے کیلئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔"[1]

اقبال کے انسان کامل اور جرمن مفکر نطشے کے فوق الانسان کو بعض انگریز تنقید نگاروں نے سمجھنے میں غلطی کی اور دونوں کو ایک ہی چیز تصور کیا۔ اقبال نے اس سلسلے میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھا۔

"میں نے آج سے قریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین انٹی کیوری" میں شائع ہوا۔ جب ۱۹۰۸ء میں میں نے "ایرانی الٰہیات" پر ایک کتاب لکھی تو اس کتاب میں اس کو شامل کر لیا گیا"[2]

اقبال کے نزدیک ان کے افکار کی تفہیم کیلئے نطشے کے بجائے ایک فلسفی ڈاکٹر الگزنڈر کے خطبات[3] کا ایک عنوان "خدا اور الوہیت" قابل مطالعہ ہے۔ موصوف مذکورہ خطبات سے ص ۳۴۷ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ جو اس طرح ہے۔

"گویا ذہن انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تجربی قوت ہے جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس و اجتہاد کی رہنمائی سے

ا۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۳۹

۲۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۷۔ ۲۲۸

۳۔ گلاسگو والے خطبات

ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ بطن گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے قوت کیا ہے۔ ہم نہ تو اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہمارا ذہن اس تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نا معلوم خدا کیلئے معابد تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے۔ اس کا احساس کیسا ہوتا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔[1]

اقبال نے ڈاکٹر الگزنڈر کے خیالات کو اپنے خیالات کی نسبت زیادہ بے باک یا جسارت آمیز قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔ جب کہ ڈاکٹر الگزنڈر کے خیالات کی رُو سے یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی جو وقت کا تابع ہوگا۔ اقبال کے نزدیک یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق ڈاکٹر الگزنڈر کے کا اپنا عقیدہ ہے اور اقبال کا عقیدہ ان کے عقیدے سے مختلف ہے۔ لیکن اقبال نے انگریزوں کو ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالنے کا مشورہ دیا ہے تاکہ یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس معلوم نہ ہو۔

مثنوی اسرار خودی پر مسٹر ڈکنسن کا ریویو بھی شائع ہوا تھا۔ مسٹر ڈکنسن نے اقبال کے نام ایک مکتوب بھی تحریر کیا تھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آپ نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے مآل قرار دیا ہے۔ اقبال نے مسٹر ڈکنسن کے اس خیال کو ان کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہوئے اپنے روحانی قوت کے قائل ہونے کا ذکر کیا ہے۔

"میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں

۱۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۸

رکھتا ۔جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔"[1]

اقبال کے نزدیک سوسائٹی کامل انسانوں کے بغیر معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور اس مقصد کیلئے محض عرفان اور حقیقت سے آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس معمہ کو حل کرنے کیلئے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ اقبال معلم کے ساتھ ساتھ پیغمبر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور رسکن یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، جو ضمیر کو زیادہ متشدد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس خط میں اقبال پیغمبر سے زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یا ان کے نزدیک ایک ایسا شخص معرض وجود میں آئے جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔

"ہم ــــــ ایک شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں ــــــــ پیکر انسانی میں صفات الٰہی کے جلوے دکھائے"[2]

مسٹر ڈکنسن نے اسرار خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کے فلسفہ سخت کوشی کا ذکر بھی کیا تھا۔ اقبال دراصل شخصی بقا پر زور دیتے ہیں اور بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقاء کیلئے تصادم کو نہایت ضروری قرار دیتے ہیں جب کہ نطشے بقائے شخصی کا منکر ہے اور حصول بقا کے آرزومندوں سے وہ بیدردی

۱۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۲۹

۲۔ سید مظفر حسین برنی ـــ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۱

سے کہتا ہے کہ "کیا تم ہمیشہ کیلئے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو"۔ اقبال کے نزدیک نطشے نے چونکہ مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کو کوشش نہیں کی اور زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اس کے بر خلاف اقبال انسان کی شخصی بقا کے زبردست حامی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان کو اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دینا چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے، ضروری سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیتا ہوں"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"میں نے محض اخلاقی زاویہ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس کہ مسٹر ڈکسن نے "فلسفہ سخت کوشی" کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے"[2]

مثنوی اسرار خودی میں اقبال کا خطاب بالخصوص مسلمانوں سے اور بالعموم عالمِ انسانیت سے تھا، چونکہ اقبال بحثیت ایک عظیم شاعر اور مفکر کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، اس لئے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا اور بعض نے تو یہ کہہ دیا کہ اقبال مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں۔ چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر ڈکنسن نے اسرار خودی کے

۱۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۲

۲۔ سید مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۳

انگریزی ترجمہ "The Secrets of Self" پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کے اسلامی افکار کو فرقہ پرستی سے تعبیر کیا۔ جس پر اقبال نے پروفیسر نکلسن کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا جس میں انسان کامل، خدا اور الوہیت اور فلسفۂ سخت کوشی کے متعلق انگریز ناقدین کے خیالات پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے آخر میں واضح کیا کہ ان کا مقصد اسلام کی وکالت کرنا نہیں بلکہ ایک عالمگیر نصب العین کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس طویل عرصے نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت کرنا نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دینوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دینوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسن معاملات کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسائیوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے"[1]

۱۔ شیخ عطاء اللہ (مرتب) اقبال نامہ۔ حصۂ اول۔ ص۔ ۴۷۴

دیباچۂ اسرارِ خودی

اسرارِ خودی کا دیباچہ اقبال نے خود ہی تحریر کیا ہے۔ اس میں فلسفۂ خودی کی تخلیق اور تجدید کے اسباب اور محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مختلف ادوار میں انسان کے ادراک اور محسوسات میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور فلسفۂ خودی کی تشریح کی گئی ہے۔ مثنوی اسرارِ خودی میں عمل پر خاصا زور دیا گیا ہے کیونکہ خودی کی تربیت اور اس کے ارتقاء سے عمل کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے مثنوی میں مسلمانوں کو عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ سری کرشن نے شریمد بھگوت گیتا میں نشکام کرم یعنی بے لوث عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک اشلوک جس کا ترجمہ خواجہ دل محمد نے ان الفاظ میں کیا ہے، سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے ؎

تجھے کام کرنا ہے اے مرد کار
نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کیے جا عمل اور نہ ڈھونڈھ اس کا پھل
عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل

اس اشلوک میں عملِ پیہم اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ رکھنے

کی تلقین کی گئی ہے۔ اقبالؔ نے سری کرشن کے فلسفہ عمل کو سراہا ہے، کیونکہ عمل زندگی کو استحکام عطا کرتا ہے۔ اقبال دیباچہ اسرارِ خودی میں لکھتے ہیں۔

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مُرادترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سی زندگی کا استحکام ہے البتہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو"[1]

سری کرشن کے بعد سری رامانج نے بھی یہی راستہ اختیار کر لیا مگر افسوس ہے کہ ان کے بعد شنکر آچاریہ کے منطقی طلسم نے اسے پھر پسِ پشت ڈال کر "سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی" شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود کے فلسفہ کو باقاعدہ صورت میں پیش کیا اور ان کے اثر سے یہ نظریہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اقبالؔ نے ابن عربی کے افکار کو مسلمانوں کے لئے نہایت ہی مضرت رساں قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے افکار مسلمانوں کو بے عملی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک شیخ کی تعلیمات قرانی تعلیمات کے منافی ہیں اور کسی تاویل یا تشریح سے قرآن کے مطابق نہیں ہو سکتیں۔ لکھتے ہیں:

"مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی

۱۔ شائستہ خان (مرتب) اسرار خودی۔ فراموش شدہ ایڈیشن۔ دیباچہ۔ ص د

تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو، جس کے وہ انتھک مُفسّر تھے، اسلامی تصوف کا ایک جزو لاینفک بنادیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے عام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہوگئے"[1]

پھر لکھتے ہیں:

"مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور اس کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کردیا۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ مُلا حسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب "دبستانِ مذاہب" میں حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا انداز نہیں ہوسکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔[2]

اسلامی ممالک میں شاعری کے ذریعے سے تصوف کے جو خیالات عام

۱۔ شائستہ خان (مرتب)۔ اسرار خودی، فراموش شدہ ایڈیشن۔ دیباچہ۔ ص ۵،۶

۲۔ شائستہ خان (مرتب) اسرار خودی کا فراموش شدہ ایڈیشن

ہوگئے۔ ان میں زندگی سے گریز کی تعلیم تھی، جو فطری طور پر انحطاط کے زمانے میں کسی بھی قوم میں پیدا ہو سکتی ہے۔ دراصل مسلمانوں میں قوّت اور توانائی کے مفقود ہونے کے پسِ پشت تاتاری حملے کارفرما ہیں جن کی بدولت اسلامی ممالک میں زندگی سے بیزاری اور مایوسی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں اقبالؔ نے خود اظہارِ خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی۔ پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شئے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین، اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع البقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ہوا"[1]

اقبالؔ کے نزدیک مسئلہ وحدت الوجود نہ تو قرآنی مسئلہ ہے اور نہ یہ اسلامی تصوف کا جزو ہے۔ اسرار خودی کے دیباچے میں تصوف کے متعلق اقبالؔ کے بیانات کے پیش نظر انہیں تصوف دشمن قرار دیا گیا۔ ان کے بیانات کو تصوف دشمنی پر محمول کر کے ان کے خلاف مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ تصوف کے مخالف ہرگز نہ تھے۔ البتہ انہیں تصوف کے بعض مسائل سے اختلاف ضرور تھا جس کا اظہار انہوں نے نثری تحریروں کے علاوہ اپنے کلام منظوم میں بھی کیا ہے۔ انہوں نے غیر اسلامی تصوف کی

۱۔ شیخ عطاالله۔ مرتب۔ اقبال نامہ حصہ اول۔ ص ۴۴۔۴۵

کڑی تنقید کی ہے۔ وہ صرف اس تصوف کے قائل تھے جو قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی تصوف انسان کے قوّت عمل کو مفلوج کردیتا ہے۔ کشمکش حیات سے گریز کرنے کی ترغیب دیکر رہبانیت سکھاتا ہے۔ جب کہ اسلامی تصوف انسان کے دل میں قوّت پیدا کردیتا ہے۔ اس کی پستی اور دوں ہمتی کو رفع کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی تصوف کا مقصد انسان کا صفات الٰیہ سے متصف ہو کر اپنی شان یکتائی کا اظہار کرنا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی کتاب ''روح اقبال'' میں لکھتے ہیں:۔

''دراصل اقبال رسمی تصوف سے اس لئے بیزار ہے کہ اس میں زندگی سے گریز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ صحیح اسلامی تصوف کے خلاف نہیں جو حرکت اور تغیّر کے اصول سے قوّت حاصل کرتا ہے اور جس میں بے عملی کے جمود کے بجائے عمل کی خالص اور پاکیزہ ترین صورت ملتی ہے جو قرآنی تعلیم پر مبنی ہے۔ اسلامی احسان و تصوف میں زندگی کے اس دائمی اور تخلیقی ارتقاء کو پیش نظر رکھا گیا جس کے باعث جدوجہد کی ہر منزل پر سالک کی نظر نئے نئے حقائق سے دوچار ہوتی ہے۔ کل یومِ ھو فی شان اور بل ھم فی البین من خلق جدید'' میں اسی جانب اشارہ ہے۔ عمل کی بدولت زندگی اپنے سارے بھید اور شانیں ایک ایک کر کے ظاہر کردیتی ہے۔ طریقت کے اس پُر پیچ راستے میں حقیقت کی منزل ہر لمحہ دور ہٹتی جاتی ہے۔ اس لئے کہ سالک کا منتہا ابدی قدریں ہوتی ہیں جو زمانی اور مکانی سیلان میں مستقل طور پر قائم رہتی ہیں لیکن ان تک پوری رسائی کسی کی بھی نہی ہو سکتی۔ وہ روشنی کے اس مینار کی مثل ہیں جن سے تھکا ہارا مسافر زندگی کے لق ودق صحرا میں رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ یہ قدریں روحانی اور اخلاقی نظام

کی اساس ہوتی ہیں۔ زندگی کا یہ حر کی نقطہ نظر ان اسلامی صوفیا کے یہاں ملتا ہے جو افلاطونی اور نوافلاطونی اوہام سے متاثر نہیں ہوئے"[1]

اس کے بر خلاف غیر اسلامی تصوف طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اقبال تصوف کے غیر اسلامی پہلو کی نسبت لکھتے ہیں:

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے"[2]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر ویدانت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"[3]

واقعہ یہ ہے کہ اقبال تمام صوفیا کے مخالف نہیں۔ وہ صرف بے عملی کا درس دینے والے اور قوم کو مفلوج بنانے والے صوفیا کو مردود قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے سید علی ہجویری داتا گنج بخش کی بڑی سراہنا کی ہے۔ داتا صاحبؒ نے اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں ائمہ اربعہ حضرت صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو صوفیا کا امام قرار دیا ہے۔ اقبال ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ اقبال نے اس تصوف کی مخالفت کی ہے جو اسلامی تو کہلاتا ہے لیکن اس میں یونانی رومی عجمی اور ہندی عناصر گھل مل گئے ہیں

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ روح اقبال۔ ص ۱۶۵۔۱۶۶

۲۔ شیخ عطاءاللہ۔ مرتب۔ اقبال نامہ۔ ص ۳۸۔۳۹

۳۔ شیخ عطاءاللہ۔ مرتب۔ اقبال نامہ۔ ۲۰۳

اور اس بناء پر انہوں نے ان غیر اسلامی عناصر سے خلط ملط ہوئے تصوف پر سخت تنقید کی ہے۔ انہوں نے منصور حلاج کے حلولی عقیدہ اور شیخ اکبر کے وجودی خیالات پر سخت نکتہ چینیاں کی ہیں اور ان کی (شیخ اکبر کی) مشہور تصنیف "فصوص الحکم" کی نسبت لکھا ہے کہ اس میں سوائے الحاد اور زندقہ کے کچھ نہیں۔ ۱۷، مئی ۱۹۱۹ء کے منصور حلاج کے متعلق حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام تحریر کیے گئے خط میں لکھتے ہیں:

"منصور حلاج کا رسالہ الطواسین جس کا ذکر ابنِ حزم کی فہرست میں ہے، فرانس میں شائع ہو گیا ہے...... حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزادھی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابنِ حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ غیر صوفیہ قریباً "سب کے سب منصورؔ سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین کیوں اس کے اس قدر دلدادہ ہو گئے"[۱]

پروفیسر آل احمد سرور اپنی کتاب "نئے اور پرانے چراغ" میں اقبال کے نقطۂ نظر اور بعض صوفیا کے نقطۂ نظر میں فرق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اقبال کے سارے فکر کی اساس مذہب ہے۔ اقبال کے یہاں یہ چیز محض وجدانی طور پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے تشریح میں موجودہ طبعیاتی و کائناتی علم سے بھی مدد لی ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر میں اور بعض صوفیوں کے نقطہ نظر میں بہت فرق ہے۔ صوفی فنا کے قائل ہیں، اقبال بقا کے، فنا کا نظریہ بے عملی اور بے حرکتی کی طرف لے جاتا ہے۔ بقا کا عمل سرگرمی کی طرف، صوفی و ملا کے

۱۔ شیخ عطاءاللہ (مرتب) اقبال نامہ حصہ اوّل۔ ص۔ ۵۴۔۵۵

خلاف اقبال نے اس وجہ سے جہاد کیا ہے کہ ان کا اسلام محکومی و نومیدی جاوید کا اسلام ہے وہ فقط مستیٔ احوال کے قائل ہیں۔ اقبال "چستیٔ کردار" پر زور دیتے ہیں۔ جبر و اختیار کو بھی وہ اسی خودی کے نظریئے کے ماتحت دیکھتے ہیں۔ جبر کا نظریہ انسان کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیتا ہے اور اسے بے بس اور مجبور ایک اندھی مشیّت کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور "اختیار" وہ اپنی اور دوسری کی تقدیر بدل دیتا ہے"[1]

اقبال نے اکابر صوفیا کی اصل تصانیف کے علاوہ شعراء کے کلام کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا ان کے نزدیک پورے ادبیات تصوف پر جدید افلاطونی فلسفہ (Neo-platonism) کے اثرات ہیں جسے مذہبِ اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اقبال نے نیو پلاٹانزم کو فلسفہ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت سے تعبیر کیا ہے جسے ان کے ایک ہیرو پلاٹیونس (Platinus) نے مذہب کی شکل میں پیش کیا۔ اس ضمن میں اقبال ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کو خان محمد نیاز الدین خان کے نام مکتوب میں رقمطراز ہیں:۔

"مسلمانوں میں یہ مذہب حرّاں[2] کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی۔ بے ہودگی پر تعمیر کی گئی"[3]

۱۳ فروری ۱۹۱۶ء کو خان محمد نیاز الدین خان کے نام تحریر کیے گئے ایک

۱۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ نئے اور پرانے چراغ۔ ص۔ ۲۶۱-۲۶۲

۲۔ حران ایک جگہ کا نام ہے۔ یہاں ثابت بن قرۃ کی ہدایت میں علم نجوم اور علم ریاضی کی کتابوں کے تراجم عہد عباسی میں ہوئے۔

۳۔ سید مظفر حسین برنی۔ (مرتب) مکاتیب کلیات اقبال۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۳۶۱

اور خط میں اقبال تصوف کے عملی اور اخلاقی حصہ کو قابل قدر بتاتے ہوئے فلسفے کے حصے کو بیکار قرار دیتے ہیں:۔

"تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدہ (کی) طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا۔ حالانکہ اسلامی نقطہ خیال سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض از دیادِ یقین و استقامت ہے۔ اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین اسلامیہ کی حکایات و مقولات کا مطالعہ نہایت مفید ہے لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے ہی سے کھلتی ہے۔"[۱]

اقبال کے نزدیک فارسی شعر و ادب گہرے طور پر عجمی خیالات سے منعکس ہے اور اس سے ایرانیوں کے علاوہ ہندوستان والے بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ حتی کہ ان کا ادبی نصب العین بھی عجمی ہو گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ تصوف کے ان غیر اسلامی عناصر کو بے نقاب کر کے حقیقی اسلام کو خالص رنگ میں پیش کریں گے۔ چنانچہ مثنوی "اسرار خودی" اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کی گئی۔ جیسا کہ منشی سراج الدین کے نام ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے

۱۔ سیّد مظفر حسین برنی (مرتب) کلیات مکاتیب اقبال۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۴۷۲

آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ ﷺ کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے؟ اور کہاں سے آیا؟ اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے"[1]

۱۔ شیخ عطاللہ۔ (مرتب) اقبال نامہ۔ ص۔ ۴۴

خودی کا مفہوم اور اس کی تشریح

اقبال سے پیشتر اور پھر ان کے عہد میں بھی خودی کا لفظ اردو اور فارسی دونوں زبانوں اور ان کے ادب میں استعمال ہوتا رہا ہے لیکن اس لفظ کو غرور یا تکبّر کے روایتی، محدود اور منفی معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے الفاظ میں "خودی کا لفظ فارسی میں خود پرستی اور نخوت و غرور وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔"[۱]

اقبال نے خودی کے لفظ کو مروجہ، روایتی اور منفی معانی کی حدود سے نکال کر قرآن کی روشنی میں مثبت اور وسیع معناں عطا کر کے اس لفظ کے مفہوم میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی اور اس لفظ کو نئے معناں عطا کر کے بنی نوع انسان کی ذات کی بے پناہ قوّتوں، اور استعداد اور کائنات اور ذات مطلق سے اس کے رشتے پر روشنی ڈالی، اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے کی ابتداء ہی میں اقبالؔ اپنے تصورِ خودی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستیز ہوتے ہیں، یہ پراسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا انا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے

۱۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۱۹

ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے، اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کیلئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا۔ جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی۔ [1]

اسرار خودی میں اس تمہید کے بعد انا یعنی خودی کے ان نظریوں سے بحث کی گئی ہے جو مختلف زمانوں میں دنیا کے مختلف قوموں کے مفکرین نے اس کے شعور اور شہود کے متعلق قائم کئے ہیں اور جن نظریوں کی بدولت کبھی انسان نے اپنی زندگی کا یقین ہی عمل سے کیا اور گاہے وہ عمل سے اس قدر بیگانہ ہوا کہ اس نے ترک عمل ہی کو اپنا مقصود حیات تصور کیا۔ اسرار کے دیباچے کے اختتام پر اقبال نے ان معنوں پر روشنی ڈالی ہے جس میں خودی کا لفظ برتا گیا ہے۔

"شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے، اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت، اس کے ثبات، استحکام اور توسیع

۱۔ شائستہ خان۔ (مرتب) اسرار خودی۔ فراموش شدہ اڈیشن، ص۔اب

سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔ ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس معنی (مثنوی) میں بمعنیٰ غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعینِ ذات ہے"[1]

اقبال کے نزدیک خودی احساسِ نفس یا تعینِ ذات کا نام ہے۔ عربی مقولہ من عرف نفسه فقد عرف ربه کی رو سے عرفان نفس حاصل کرنے والا ہی رب کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح خودی عرفان نفس کا نام ہے، خودی کو ایک ایسی قوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات یا نائب حق بنا کر اسے دنیا کی تمام مخلوقات پر تفوق عطا کیا ہے۔ چنانچہ اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو پہچانے اور اپنی استعداد کو بیدار کر کے بروئے کار لائے۔ انسان اپنی قوت یا صلاحیتوں کو انسان کی ضرر رسانی کیلئے بھی استعمال کرنے کا مختار ہے لیکن ان صلاحیتوں کو انسانی فلاح و بہبود کیلئے بروئے کار لانے کی صورت میں اور اپنی خودی کو قانونِ الٰہی کے تابع کرنے سے خودی "مسلمان" ہو جاتی ہے اور اگر اس کی خودی قانونِ الٰہی کے تابع نہ رہے بلکہ ایک طرح سے سرکشی اختیار کر لے تو وہ مسلمان نہیں کہلائی جائے گی۔ اقبال خودی کی قوت کے مثبت اور منفی پہلو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی۔ قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کیلئے پامال

---

[1] شائستہ خان (مرتب) اسرار خودی۔ فراموش شدہ اڈیشن۔ ص۔ ک۔ ل

کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے"[1] اقبال کے نزدیک، کائنات کا وجود یا پیکرِ ہستی خودی ہی کا نتیجہ ہے، ماسواء کا وجود خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔ اس وقت تک خودی کا اثبات ممکن نہ تھا جب تک خودی اپنا غیر پیدا نہ کرتی۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں قوتِ خودی پوشیدہ ہے۔ اس لئے انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر خودی کی تحقیق میں مصروف ہو جائے۔ کیونکہ خودی عرفانِ نفس کا نام ہے، تعیّنِ ذات ہے، اور جس نے اپنی ذات کا تعین کیا، اسے رب کی معرفت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
زندگی کا وجود خودی کے آثار میں سے ہے
ہرچہ می بینی ز اسرار خودی است
تو جو کچھ دیکھتا ہے وہ خودی کے اسرار کا اظہار ہے
وانمودن خویش را خوی خودی است
اپنے آپ کو ظاہر کرنا خودی کی فطرت یا عادت ہے
خفتہ در ہر ذرّہ نیروی خودی است
ہر ذرّے میں خودی کی قوّت پنہاں ہے
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است
چونکہ اس جہان کی زندگی کا دارومدار خودی کی قوّت پر ہے

۱۔ شیخ عطاء اللہ (مرتب) اقبال نامہ، حصہ اوّل، ص۔ ۲۰۲

پس بقدرِ استواری زندگی است

اس لئے ہر وجود کی زندگی کا مقام یا درجہ اس کی خودی کے استحکام کے مطابق ہے۔

دگر از شنکر و منصور کم گوی

اب شنکر اور منصور کے متعلق کم ہی کہہ دے

خدارا ہم براہِ خویشتن گوی

خدا کو بھی اپنے ہی انداز سے تلاش کر

بخود گم بہر تحقیقِ خودی شو

اپنے آپ میں ڈوب کر یا گم ہو کر خودی کی تحقیق میں مصروف ہو جا

انا الحق گوی و صدیقِ خودی شو

انا الحق کا نعرہ بلند کر کے خودی کا دوست بن جا۔

"شخصیت" خودی کی اصطلاح کا پیش خیمہ

اقبال بہت پہلے سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور معاشی غرض مختلف مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ شخصیت اور کردار کی استواری بھی اقبال کی توجہ کا مرکز رہے ہیں، کیونکہ انہیں پر اقوام کی بقا اور ان کے ارتقاء کا انحصار ہے۔ بقول اقبالؔ کردار ہی وہ غیر مرئی قوّت ہے جس سے قوموں کے مقدر متعین ہوتے ہیں۔ اقبالؔ اس زمانے میں ملّتِ اسلامیہ بالخصوص برِ اعظم ہند کے مسلمان جن خطرات میں گھرے ہوئے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کیلئے مسلمانوں کے عزم و عمل کی قوّت میں انقلاب برپا کرنا ناگزیر سمجھتے تھے۔ لیکن عجمی تصوف کے منفی نظریات اور ایشیائی شاعری کے حیات گریز رجحانات نے مسلمانوں کو ذوقِ عمل سے یکسر محروم کردیا تھا۔ سکون و جمود کے اس طلسم کو توڑنے کیلئے انہوں نے اثبات خودی کے فلسفے پر غور و فکر کرنا شروع کردیا۔ اس غور و فکر کے اوّلین آچار ہمیں بیاضِ اقبال کے مختلف شذرات میں نظر آتے ہیں۔ مثنوی اسرارِ خودی میں مکمل ضابطۂ حیات کی صراحت کی گئی ہے اور اس کا محور خودی ہے۔ فلسفۂ خودی اقبال کے یہاں کسی فوری یا اضطراری جذبے کی پیداوار یا نتیجہ نہیں بلکہ اس فلسفے کے پس پشت اقبال کا سالہا سال کا تفکّر اور تدبّر کارفرما ہے۔ مثنوی اسرار خودی کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی لیکن اس سے قبل

بھی اقبالؔ کے یہاں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور یہ ابتدائی نقوش قیامِ یورپ ہی کے زمانے سے ابھرنا شروع ہوئے تھے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے خودی کی اصطلاح نہایت وسیع معناں میں استعمال کی ہے لیکن اس مثنوی کی تصنیف سے قبل وہ خودی کی اصطلاح کے بجائے "شخصیّت" استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی اقبال کی بیاض بعنوان "Stray Reflections" (جس کا ترجمہ "شذراتِ فکرِ اقبال" کے نام سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کیا ہے) جہاں مختلف موضوعات اور مسائل پر اقبال کے خیالات اور عقائد پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہاں فلسفۂ خودی کے ابتدائی نقوش یا آثار یا خاکے سے متعلق بھی ان کے افکار سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ "Stray Reflections" میں شخصیّت کی بقاء پر اظہار خیال کرتے ہوئے اقبال اس کے حصول کی خاطر جدو جہد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ انسان کی شخصیّت اور قوّت کا ذکر کرتے ہوئے انسان کو قوّتوں کا ایک مجموعہ قرار دیتے ہیں، اور شخصیّت ان قوّتوں کی ایک مخصوص ترتیب سے عبارت ہے۔ چنانچہ اپنی شخصیّت میں استحکام پیدا کرنے کی خاطر ہمیں ویسا ہی اسلوبِ زندگی اختیار کرنا چاہیے، اس کی قوّتوں کی تربیت اور ان قوّتوں کے عمل کا تسلسل قائم رہے کہ یہی شخصیّت کی بقاء کا راز ہے۔ اقبال کے دوسرے شذراتِ فکر میں بھی قوّت[1] کا ذکر آیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے فلسفۂ خودی کا اوّلین مقصد و محرّک قوم کو حصول قوّت کی ترغیب دینا ہے۔

---

۱ اقبال اپنے بزرگ دوست لسان العصر اکبر الہ آبادی کو ۱۸، اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھے گئے ایک خط میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کیلئے یہی خیال محرک ہوا۔ میں گذشتہ دس سال سے اسی پیچ و تاب میں ہوں۔ اقبال نامہ حصّہ دوم۔ ص۔ ۴۵

" Personality being the dearest possession of man must be looked upon as the ultimate goal. It must work as a standard to test the worth of our actions. That is good which has a tendency to give us the sense of personality, that is bad which has a tendency to suppress and ultimately dissolve personality. By adopting a mode of life calculated to strengthen personality we are really fighting agasint death........ Personal immortality then lies in our own hands. It requires an effort to secure the immortality of the person" [1]

اس اقتباس کا ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ لہذا اس کو خیر مطلق قرار دینا چاہئے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہئے۔ خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کردینے کی طرف مائل ہو۔ اگر ہم وہ طرز زندگی اختیار کریں جس سے شخصیت کو تقویت پہنچے تو دراصل ہم موت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔۔۔۔۔ پس شخصیت کی بقا ہمارے اختیار میں ہے۔ اس کے حصول کیلئے جدوجہد ضروری ہے۔" [۲]

---

1. Dr Javed Iqbal (Editor) Stray Reflections
   (A note book of Allama Iqbal), P. 36

۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ (مترجم) شذرات فکر اقبال۔ ص۔ ۷۷۔ ۷۸

اقبال کی بیاض "Stray Reflections " سے فلسفۂ خودی کے ابتدائی نقوش یا آثار کی نسبت کئی اور جملے اور اقتباسات ملتے ہیں۔ مذکورہ بیاض میں کئی مرتبہ قوت اور مرد قوی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملے دیکھئے۔

" The powerful man creates environment, the feeble have to adjust themselves" [1]

"قوی انسان ماحول کی تخلیق کرتا ہے۔ کمزوروں کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے" [۲]

" Powerful toucheth falsehood and lo; it is transformed into truth" [3]

"قوت باطل کو چھو لیتی ہے تو باطل حق میں بدل جاتا ہے" [۴]

اقبال "The thought of the powerful man " عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

"Civilization is a thought of the power (powerful) man" [5]

یعنی تہذیب مرد قوی کا ایک خیال ہے۔

مثنوی اسرار خودی کے ذیل کے اشعار اقبال کے انہیں خیالات کی

---

1. Dr. Javed Iqbal (Editor) Stray Reflections. p. 90

۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مترجم) شذرات فکر اقبال۔ ص۔ ۱۳۲

3. Dr. Javed Iqbal (Editor) Stray Reflections. p. 90

۴۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، (مترجم) شذرات فکر اقبال۔ ص۔ ۱۳۳

5. Dr. Javed Iqbal (Editor) Stray Reflections- p. 91

ارتقائی اور ارتقائی شکل ہیں۔ مثلاً قوت کے حصول کیلئے اقبال "یا قوی" کا وظیفہ تجویز کرتے ہیں۔

اہل قوت شوز وردِ "یا قوی"

یا یہ اشعار جن میں اقبال بتاتے ہیں کہ قوت کی بدولت باطل عارضی طور پر حق کی شان اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ واقعات کی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلان حق
مدعی گرمایہ دارِ قوت است
دعویٔ او بے نیاز از حجت است

اقبال اسرار خودی میں پیش کیے گئے افکار و خیالات کو ۱۹۰۷ء سے ظاہر کرتے رہے ہیں جیسا کہ سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"جو خیالات میں نے مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ نظم ونثر و انگریزی و اردو موجود ہیں۔"[۱]

۱۔ شیخ عطاء اللہ (مرتب) اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ۱۱۰

معرکۂ اسرار خودی

دراصل اقبال مثنوی اسرار خودی کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں عرصۂ دراز سے راسخ ہوئے غیر اسلامی عقائد اور تصورات کی جگہ اس حقیقی اسلام کو، جسے رسول مقبول ﷺ نے پیش کیا تھا، دکھانا چاہتے تھے، کیونکہ اقبال کی نظر میں ہندوستان کے مسلمان اس عربی اسلام کو بہت کچھ فراموش کر چکے تھے اور انہوں نے عجمی اسلام کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں عجمی تصوف یا غیر اسلامی تصوف کے زیر اثر نفیٔ خودی کا تصور کافی پختہ ہو چکا تھا، دوسری طرف بدھ مت اور ہندو مت کی رُو سے اپنی خودی کو مٹا دینے والا منش خدا کا ہم ذات ہو جاتا ہے یا خود خدا بن جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں قناعت توکل اور تسلیم و رضا کے تصورات بھی اقبال کی نظر میں یہاں غیر اسلامی ہو کر رہ گئے تھے۔ نفس کشی کیلئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ انسان آرزوں اور خواہشات کو ترک کر دے اور ترک خواہش یا ترکِ آرزو سے قرب الٰہی حاصل ہونے کا عقیدہ عام ہو چکا تھا۔ اقبال نے مسلمانوں میں رائج ان تمام غیر اسلامی تصورات اور عقائد سے مسلمان قوم کو آگاہ کیا اور حقیقی اسلام تک اس کی رہنمائی کی۔ لیکن افسوس کہ اقبال کے خلاف مخالفتوں کا بازار گرم ہو گیا اور ان مخالفتوں نے ایک معرکہ کی شکل اختیار کی جسے معرکۂ اسرار خودی سے تعبیر کیا

جاسکتا ہے۔ سیّد شوکت حسین نے اسرارِ خودی کے جواب یا ردِ عمل میں فارسی میں ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم "خطاب بہ اقبال" کتابچے کی صورت میں شائع کرا کے خود اقبال اور دوسرے کئی اہل قلم کو بھیجی۔ جس میں اقبال سے اپنے خیالات کو محض نظریے کی حد تک محدود نہ رکھنے بلکہ خود اس کا عملی پیکر بن کر قوم کے سامنے آنے کیلئے کہا گیا تھا۔ سیّد صاحب نے نظم کی ابتداء میں اقبال کی مثنوی اسرار خودی سے ایک خاص رائے قائم کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس سے اقبال کو ایک مظلوم قوم کی آزادی کیلئے اشک ریزی کا پہلو دکھانا مقصود ہے۔ کئی شعراء حضرات، جن میں اقبال کے قریبی دوست غلام قادر گرامی اور عزیز لکھنوی بھی شامل ہیں، نے اس نظم کی سراہنا کی لیکن پروفیسر نکلسن مترجم اسرار خودی نے شوکت حسین کی نظم کے مندرجات سے شدید اختلاف کیا اور لکھا:۔

"عزیزم! میں آپ کا نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی نظم "خطاب بہ اقبال" کا ایک نسخہ بجھوایا۔ میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ میرے نزدیک یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مظلوم اور پسماندہ قوم کی آزادی کے لئے اشک ریزی کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ یقیناً یہ اسرار خودی کا ماحصل نہیں۔ آزادی اور سربلندی کی منزل خود اعتمادی اور نظم و ضبط سے حاصل ہوتی ہے"

اقبال بھی سیّد شوکت حسین کی نظم سے محظوظ ہوئے تھے اور موصوف کو مختصراً لکھا کہ آپ کی نظم موصول ہو گئی ہے۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ اسرار خودی اقبال کا قال ہے مگر ممکن ہے کہ آپ کا حال ہو۔ اگر ایسا ہو تو میرے لئے بھی دعا فرمایئے۔ لاہور۔ ۷۔ فروری۔ ۱۹۲۶ء"

سیّد شوکت حسین کے علاوہ خان بہادر پیر زادہ مظفر احمد فضلی نے بھی اسرار خودی کے جواب میں "رازِ بے خودی" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھ کر اقبال کو نہ صوف تصوف دشمن بلکہ اسلام دشمن تک قرار دیا، لیکن مثنوی اسرار خودی بعد میں ایک ایسی تصنیف ثابت ہوئی جس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر یورپی ممالک میں بھی اقبال کو شہرت عطا کی۔ حالانکہ اقبال نے یہ مثنوی پہلے ہندوستان ہی کیلئے لکھی تھی اور انہیں اس بات پر بڑا تعجب ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ وہ قوم جس کیلئے اس مثنوی کی تخلیق کی گئی تھی، ٹھیک طرح سے اس کے مفہوم کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہی۔ لیکن وہ تو میں جن سے اس مثنوی میں خطاب ہی نہ تھا۔ اس کا مطلب سمجھ گئی ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر رینالڈ۔ اے۔ نکلسن مثنوی اسرار خودی کا مطالعہ کرنے کے بعد گہرے طور پر متاثر ہوئے اور اس مثنوی کا علامہ اقبال سے (جن سے ان کی ملاقات کیمبرج میں کوئی پندرہ برس قبل ہوئی تھی) انگریزی میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ علامہ اقبال نے پروفیسر نکلسن کی اس تجویز یا درخواست پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ لیکن اس دوران پروفیسر نکلسن کئی دیگر علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے جن کے باعث اس ترجمے میں قدرے تاخیر ہوئی بالآخر اسرار خودی کا منظوم انگریزی ترجمہ " Secrets of the self " کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ جب کہ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت 1915ء میں ہوئی تھی۔ فاضل ترجمہ کار نے اس ترجمے پر ایک نہایت ہی وقیع اور بسیط دیباچہ تحریر کیا ہے۔ ترجمے کے اختتام پر ملک راج آنند کا ایک عمدہ مضمون "The humanism of Iqbal" بھی درج ہے۔ یہ مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن کا منظوم انگریزی

ترجمہ ہے جس نے اقبال کی فکر کو یورپی ممالک سے روشناس کرایا اور اقبال کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔" The secrets of the self" کے دیباچے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

" The cry" back to the Koran! Back to Mohammad! " has been heard before and the responses have hitherto been somewhat discouraging. But on this occasion it is allied with the revolutionary force of western philosophy, which Iqbal hopes and believes will vitalise the movement and ensure its triumph. He sees that hindu intellectualism and Islamic pantheism have destroyed the capacity for action, based on scientific observation and interpretation of phenomena, which distinguishes the western peoples, and espacially the English". Now this capacity depends ultimately on the conviction the Khudi (selfhood, individuality, personality) is real and is not merely an illusion of the mind. Iqbal therefore, throws himself with all his might against idealistic philosophers and pseudo-mystical poets, the authors, in his opinion of the decay

prevailing in Islam, and argues that only by self-affirmation, self expression and self development can the muslims once more become strong and free"[1]

مہاراجہ کشن پرشاد شاد صدر اعظم حیدر آباد دکن سے علامہ اقبال کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ جب اقبال کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" شائع ہوئی تو مہاراجہ نے اس میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، موصوف بھی تصوف کا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اقبال سے دریافت کیا کہ اس مثنوی کی تخلیق کا خیال آپ کو کیسے پیدا ہوا؟ اور علامہ کو اہل تصوف، جن میں خواجہ حسن نظامی بھی شامل تھے، کے اعتراضات بالخصوص خواجہ حافظؔ پر تنقید والے حصّے سے متعلق باخبر کیا۔ جس پر اقبال نے انہیں بتایا۔

"یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کیلئے کیوں انتخاب کیا گیا جب تک اس کا دوسرا حصّہ ختم نہ ہولے گا میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ میرا ابھی ایک فرض ہے اور شائد میری زندگی کا اصل مقصد یہی ہے۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہو گی کیونکہ ہم سب انحطاط کے

---

1. R. A. Nicholson (translator) Secrets of the self. p.12

زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بد نصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربّی تصور کرتا ہے مگر

من صدائے شاعر فرداستم
نا امید استم زیاران قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا۔ ضرور اُگے گا۔ اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے"[1]

اقبال مہاراجہ کے بڑے قدر دان تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔ بقول عبدالطیف اعظمی "اقبال کی یہ تمام قدردانی اور عزت افزائی شاد کے صوفیانہ خیالات اور ان کی متصوفانہ شاعری کی وجہ سے تھی[2]

اقبال نے جب غیر اسلامی تصوف پر تنقید کی۔ تو بعض صوفیانہ باتوں کو آڑ بنا کر اقبال کو ہدفِ تنقید بنایا گیا، ان کی مدافعت میں اقبال نے بعض علمائے کرام کے نام مفصّل مکتوبات تحریر کیے، جن میں اصل حقیقت واضح کی گئی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اقبال کے دو خطوط پیش کئے جاسکتے ہیں، ایک خواجہ حسن نظامی کے نام ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو تحریر کیا گیا ہے اور دوسرا شاہ سلیمان پھلواری کے نام ۱۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا گیا ہے، یہ دونوں خطوط ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سیّد راشد۔ مکالمات اقبال۔ ص۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶

۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ (مرتب) اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں اقبال کے خطوط اپنے معاصرین کے نام۔ عبدالطیف اعظمی۔ ص۔ ۳۶۷

خواجہ حسن نظامی کے نام

لاہور۔۲۰، دسمبر ۱۵ء

مخدومی خواجہ صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا والانامہ مل گیا[۱] آپ کی علالت کا حال معلوم کر کے تردّد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صحتِ عاجلہ عطا فرمائے۔

مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام[۲] سے عشق ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقتِ اسلامی[۳] معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر[۴] میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے۔ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی[۵] ہو گیا تھا۔ کیونکہ فلسفہ یورپ[۶] بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مگر قرآن[۷] پر تدبّر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم[۸] ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے

۱۔ اوراق گم گشتہ: ملا

۲۔ اوراق گم گشتہ: (پیغمبر اسلام)

۳۔ اوراق۔ اسلامی حقیقت

۴۔ اوراق: بالآخر آپ

۵۔ اوراق: تیز ہو گیا تھا

۶۔ اوراق: یورپین فلسفہ

۷۔ اوراق: قرآن میں

۸۔ اوراق: بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا

قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کیلئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔

رہبانیت اور اسلام پر مضمون ضرور لکھوں گا مگر[1] آپ کے مضمون کے بعد رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ[2] ہر قوم میں پیدا ہوئی ہے اور ہر جگہ اس نے شریعت[3] اور قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے اسلام حقیقت میں[4] اسی کے خلاف ایک[5] صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا[6] (اور تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی[7] تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ قرمطی تحریک[8] سے بھی تصوف نے فائدہ اٹھایا ہے محض اس وجہ سے کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامی کو فنا کرنا تھا۔ بعض صوفیا کی نسبت تاریخی شہادت بھی[9] اس امر کی موجود ہے کہ وہ قرمطی تحریک سے[10] تعلق رکھتے تھے۔

۱۔ اوراق: لیکن آپ کے

۲۔ اوراق: خاص نہیں ہے

۳۔ اوراق: قانون شریعت کا مقابلہ

۴۔ اوراق: در حقیقت

۵۔ اوراق: اسی رہبانیت کے خلاف

۶۔ اوراق: قوسین ندارد اور اس جگہ تصوف سے میری مراد

۷۔ اوراق: رہبی

۸۔ یہاں تک کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا

۹۔ اوراق: شہادت موجود ہے کہ وہ

۱۰۔ قرمطی تحریک:۔ شیعوں کا ایک فرقہ جو قرمطی نامی ایک شخص سے منسوب ہے۔ حجاج کے زمانے میں قرمطیوں نے مکے پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کی اور حجر اسود نکال کر لے گئے مگر پھر واپس کر دیا۔ یمن، بحرین اور عمان میں ان کا زور رہا۔ محمود غزنوی نے ان کی سرکوبی کی۔

اب تک جو اعتراضات آپ کی طرف سے ہوئے ہیں، وہ مثنوی کے دیباچے[1] پر ہیں (نہ کہ) خود مثنوی پر۔ جب تک[2] مجھے یہ معلوم[3] نہ ہو کہ مثنوی پر کیا اعتراضات ہیں[4]۔ اس وقت تک میں کیونکر قلم اٹھا سکتا ہوں۔ مثنوی پر جو اعتراض[5] آپ نے کیا ہے۔ وہ اسی قدر[6] ہے کہ حافظ کی بے حرمتی کی گئی۔ لیکن جب تک اصولی بحث نہ ہو، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں حافظ کی تنقید[7] میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

حضرت[8] امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ[9] بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن[10] میرے نزدیک گسستن عینِ اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف[11] ہے اور اسی[12] کے خلاف میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گذشتہ علمائے اسلام نے ایسا ہی کیا ہے اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ[13] نے مجھے سر الوصال کا خطاب[14] دیا تھا تو میں نے آپ

۱۔ اوراق: دیباچہ پر ہوئے ہیں کہ خود مثنوی پر

۲۔ اوراق: اس لئے جب تک

۳۔ اوراق: یہ نہ معلوم ہو

۴۔ اوراق: کہ مثنوی پر آپ کے کیا اعتراضات ہیں

۵۔ اوراق: اب تک مثنوی پر

۶۔ اوراق: وہ یہ ہے کہ اس میں حافظ شیرازی کی بے حرمتی کی گئی ہے

۷۔ اوراق: کہ میں حافظ پر تنقید کرنے میں

۸۔ اوراق: حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

۹۔ اوراق: یہ بحث کی ہے

۱۰۔ اوراق: یا پیوستن، یعنی، فراق اچھا ہے یا وصال، میرے نزدیک

۱۱۔ اوراق: ایرانی (غیر اسلامی) تصوف

۱۲۔ اوراق: اور میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج

۱۳۔ اوراق: یاد ہو گا جب

۱۴۔ اوراق: لقب دیا تھا

کو لکھا تھا کہ مجھے سرّ الفراق کہا جائے اس وقت میرے[1] ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد[2] الف ثانی نے کیا ہے۔ آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہو گا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روحِ انسانی کا ہے۔ اس سے آگے اور کوئی مرتبہ یا مقام نہیں[3] یا محی الدین[4] ابن عربی کے الفاظ میں "عدم محض" ہے یا بالفاظ دیگر[5] یوں کہیئے کہ حالت سکر، منشائے اسلام[6] اور قوانین حیات کے مخالف[7] ہے اور حالت صحو، جس کا دوسرا نام اسلام ہے، قوانین حیات کے عین مطابق ہے اور رسول کریم[8] ﷺ کا منشاء[9] یہ تھا کہ ایسے آدمی[10] پیدا ہوں جن کی مستقل[11] حالت کیفیت (صحو) ہو، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہ[12] میں صدیقؓ و عمرؓ تو بکثرت ملے مگر حافظ شیرازی کوئی نظر نہیں آتا۔ مضمون[13] بہت طویل ہے اور اس[14] مختصر خط میں سما نہیں سکتا۔[15] میں ان شاءاللہ اس پر مفصل بحث کروں گا جب حالات مساعدت کریں گے۔ مگر

۱۔ اوراق: اس وقت بھی
۲۔ اوراق: جو حضرت مجدد الف ثانیؒ
۳۔ اوراق: یا مقام ندارد
۴۔ اوراق: محی الدین ندارد
۵۔ اوراق: دگر یوں کہہ سکتے ہیں
۶۔ اوراق: منتہائے اسلام
۷۔ اوراق: دونوں کے خلاف ہے
۸۔ اوراق: خود آں حضرت ﷺ
۹۔ اوراق: کا منشا بھی یہی تھا
۱۰۔ اوراق: کہ ایسے لوگ
۱۱۔ اوراق: مستقل ندارد
۱۲۔ اوراق: کہ آپ کے صحابہ میں ہمیں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تو ملتے ہیں لیکن
۱۳۔ اوراق: یہ مضمون
۱۴۔ اوراق: اور ندارد
۱۵۔ اوراق: سما نہیں سکتا۔ ان شاءاللہ

شیخ محی الدین[1] ابن عربی کے ذکر سے ایک بات یاد آ گئی۔[2] جو عرض کرتا ہوں۔ اس واسطے کہ آپ کو غلط فہمی نہ رہے۔ میں شیخ کی عظمت[3] و فضیلت کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بہت بڑے حکماء[4] میں سمجھتا ہوں۔ مجھ کو ان کے اسلام میں[5] کیونکہ جو عقائد[6] (مسئلہ قدم ارواح و مسئلہ وحدت الوجود) ان کے ہیں ان کو انہوں نے فلسفہ کی بناء پر نہیں[7] مانا بلکہ نیک نیتی سے قرآن کی آیات[8] سے استنباط کیا ہے۔ پس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط، قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کو جو تاویل ان کی[9] وہ منطقی یا منقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط، میرے نزدیک ان کی[10] تعبیر یا تاویل جو کچھ ہے صحیح نہیں ہے۔ اس واسطے گو میں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں، مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ صوفیا کو توحید[11] اور وحدت، کا مفہوم سمجھنے میں

۱۔ اوراق: مگر شیخ ابن عربی

۲۔ اوراق: یاد آئی جس کو اس لئے بیان کرتا ہوں کہ آپ کو

۳۔ اوراق: عظمت و فضیلت دونوں کا

۴۔ اوراق: میں سے

۵۔ اوراق: میں بھی کوئی شک نہیں ہے

۶۔ اوراق: جو عقائد ان کے ہیں (مثلاً قدم ارواح اور وحدت الوجود)

۷۔ اوراق: نہیں جانا

۸۔ اوراق: قرآن حکیم سے مستنبط کیا ہے

۹۔ اوراق: جو تاویل انہوں نے پیش کی ہے

۱۰۔ اوراق: ان کی پیش کردہ تاویل یا تفسیر صحیح نہیں ہے اس لئے

۱۱۔ مضمون "اسرار خودی اور تصوف" میں حضرت علامہ نے مسئلہ قدم ارواح اور وحدت الوجود کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ گو میں ان کے ماننے والوں کو کافر نہیں کہہ سکتا کیونکہ انہوں نے نیک نیتی سے ان مسائل کا استنباط قرآن شریف سے کیا ہے (مقالات اقبال ص۔ ۱۶۱)

سخت اغلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں [2] مرادف نہیں بلکہ مقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور موٴخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کے مقابلہ [3] میں یا اس کی ضد لفظ 'کثرت' نہیں جیسا کہ صوفیاء نے تصور کیا ہے بلکہ اس کی ضد شرک ہے۔ وحدت الوجود کی ضد، کثرت، ہے اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدت الوجود یا زمانہ حال کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا۔ وہ موحد تصور کیے گئے۔ حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلے کا تعلق مذہب [4] سے نہ تھا بلکہ نظامِ عالم کی حقیقت سے تھا [5] اسلام کی تعلیم نہایت صاف [6] و روشن ہے، یعنی یہ کہ عبادت کے قابل [7] صرف ایک ذات ہے، باقی جو کچھ کثرت نظامِ [8] عالم میں نظر آتی ہے، وہ سب کی سب مخلوق ہے، گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کنہ اور حقیقت ایک [9] ہی ہو، چونکہ صوفیا نے فلسفے اور مذہب کے دو مختلف مسائل یعنی توحید [10] اور وحدت الوجود کو ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا ہے اس واسطے ان کو یہ فکر [11] ہوئی کہ توحید [12] کو ثابت کرنے کا کوئی اور طریق

۱۔ اوراق: بڑی غلطی

۲۔ اوراق: مترادف نہیں ہیں مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی

۳۔ اوراق: توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں بلکہ شرک ہے ہاں وحدت الوجود کی ضد

۴۔ اوراق: بالکل نہ تھا

۵۔ اوراق: (یعنی یہ کہ اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے)

۶۔ اوراق: صاف اور واضح اور روشن

۷۔ اوراق: لائق صرف

۸۔ اوراق: نظام ندارد

۹۔ اوراق: اس کی حقیقت ایک ہی کیوں نہ ہو

۱۰۔ اوراق: مسائل (وحدت الوجود اور توحید) کو ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا، اس واسطے

۱۱۔ اوراق: فکر لاحق ہوئی

۱۲۔ اوراق: توحید کو ثابت

ہونا چاہیے، جو عقل[1] وادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو، اس غرض کیلئے حالت سکر ممد ومعاون[2] ہوئی اور یہ اصل ہے مسئلہ حال وہ مقامات کی، مجھے حالتِ سکر کی واقعیت سے انکار نہیں، صرف اس بات سے انکار ہے کہ جس غرض کیلئے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے۔ وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی، اس[3] سے زیادہ سے زیادہ صاحبِ حال کو ایک علمی مسئلے کی تصدیق ہو جاتی ہے، نہ[4] مذہبی مسئلے کی صوفیا نے وحدت الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے[5] ہے (شیخ عربی کے نزدیک یہ انتہائی مقام ہے اور اس کے آگے[6] عام محض ہے) لیکن یہ سوال کسی دل[7] میں پیدا نہیں ہوا کہ آیا یہ مقام کسی حقیقت نفس الامری کو واضح کرتا[8] ہے؟ اگر کثرت حقیقت نفسف الامری ہے تو یہ کیفیت وحدت الوجود جو صاحب[9] حال پر وارد ہوتی ہے، محض دھوکا ہے اور مذہبی[10] اور فلسفیانہ اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اگر کیفیت وحدت الوجود محض ایک مقام ہے اور کسی حقیقت نفس الامری کا انکشاف اس[11] سے نہیں ہوتا تو پھر اس کو معقول طور

۱۔ اوراق: عقل اور

۲۔ اوراق: ممد ومعاون ہوتی ہے اور یہ ہے اصل مسئلہ حال ومقامات کی، انکار صرف اس بات سے

۳۔ اوراق: اس سے ندارد

۴۔ اوراق: نہ کہ مذہبی مسئلے کی (یعنی حالت شکر یا جذب ومستی میں سالک کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ واقعی کائنات میں اللہ کے سوا اور کسی کا وجود نہیں ہے) صوفیا نے وحدت الوجود

۵۔ اوراق: قوسین ندارد، اور شیخ اکبر کے نزدیک

۶۔ اوراق: کسی صوفی کے دل میں

۷۔ اوراق: آیا یہ مقام حقیقت نفس الامری کو بھی واضح کرتا ہے یا نہیں؟

۸۔ اوراق: جو سالک پر طاری ہوتی ہے

۹۔ اوراق: مذہب یا فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے نیز اگر یہ کیفیت وحدت الوجود

۱۰۔ اوراق: کا اس سے انکشاف

۱۱۔ اوراق: ثابت کرنا بھی بے سود ہے

سے ثابت کرنا فضول ہے۔ جیسا کہ محی الدین[1] ابن عربی اور دیگر صوفیا نے کیا ہے۔ نہ اس[2] کے محض مقام ہونے سے روحانی زندگی کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ قرآن کی تعلیم کی رُو سے[3] وجود فی الخارج کو ذاتِ باری سے نسبت اتحاد کی نہیں بلکہ مخلوقیت کی ہے، اگر قرآن کریم[4] کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذات باری[5] کثرت نظام عالم میں دائر و سائر ہے تو کیفیتِ وحدت الوجود کو قلب پر وارد کرسکتا[6] مذہبی زندگی کیلئے نہایت مفید ہوتا۔ بلکہ جو مذہبی[7] زندگی کی آخری منزل ہوتی مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے۔[8] ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ میرے نزدیک[9] ہر کیفیت قلبی مذہبی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں رکھتی، اور علم الحیات کی رُو سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کا ورود حیاتِ انسانی کیلئے فردی اور ملیّ اعتبار سے مضر ہے۔ مگر علم الحیات کی رُو سے اس پر بحث کرنا بہت فرصت چاہتا ہے۔ جس پر پھر کبھی لکھوں گا۔

۱۔ اوراق: جیسا کہ ابن عربی اور ان کے متبعین نے

۲۔ اوراق: اور نہ اس کے مقام ہونے کی بنا پر ہمیں روحانی زندگی میں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے

۳۔ اوراق: کیونکہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کی رو سے وجود فی الخارج (کائنات) کی ذات باری کے ساتھ اتحاد یا عینیت کی نسبت نہیں ہے بلکہ مخلوقیت کی نسب ہے (یعنی خدا خالق ہے اور کائنات مخلوق ہے اور خالق اور مخلوق کے مابین مغائرت ہوتی ہے)

۴۔ اوراق: کریم ندارد

۵۔ اوراق: باری تعالیٰ

۶۔ اوراق: وارد کرنا

۷۔ اوراق: بلکہ یہ کیفیت مذہبی زندگی

۸۔ اوراق: اضافہ (یعنی قرآن کی رُو سے خالق اور مخلوق یا عابد اور معبود میں مغائرت کلی ثابت ہوتی ہے)

۹۔ اوراق: یہ کیفیت قلبی یا ذہنی اعتبار سے

فی الحال اس خط کو ختم کرتا ہوں اور اس طویل سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ فقط

آپ کا خادم

محمد اقبال

خطوط اقبال۔ اوراق گم گشتہ۔

۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو شاہ سلیمان پھلواری کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"......مجھے اس کا یقین تھا کہ آپ کی مثنوی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمالِ روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے۔ میں نے خواجہ حسن نظامی کو بھی لکھا تھا کہ مثنوی سے اختلاف نہ کیجئے۔ دیباچے میں جو بحث ہے، اُس پر لکھئے، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے آج تک ایک حرف بھی اس کے متعلق نہیں لکھا۔ آپ کی تحریر سے مجھے یقیناً فائدہ ہوگا۔ مگر میری استدعا ہے کہ مثنوی کے متعلق بھی جو خیال آپ نے خط میں ظاہر فرمایا ہے اس مضمون میں ظاہر فرمائیے کہ جو غلط فہمی خواجہ حسن نظامی کے مضامین سے پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے، دیباچے کی بحث ایک علیٰحدہ بحث ہے اور وحدت الوجود کا مسئلہ اس میں ضمناً آگیا ہے۔ اس مسئلے کے متعلق جو کچھ میرا خیال ہے وہ میں نے پہلے خط میں عرض کر دیا تھا، فارسی شعراء نے جو تعبیر اس مسئلے کی کی ہے اور جو نتائج اس سے پیدا کئے ہیں ان پر مجھے سخت اعتراض ہے، یہ

تعبیر مجھے نہ صرف عقائد اسلامی کے مخالف معلوم ہوتی ہے بلکہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوام اسلامیہ کے لئے مضر ہے۔ یہی تصوف عوام کا ہے اور شیخ علی حزین نے بھی اسی کو مد نظر رکھ کر کہا تھا کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں، میں نے تصوف کا لٹریچر کرات[1] سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دئیے ہیں، جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہو، وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ کہ مخالف۔ انہیں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے، ہی مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دیدیا ہے اور یہ حملہ انہوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے۔ ان حالات کو مد۔نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تصوف اسلامیہ کی ایک تاریخ لکھی جائے جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر کی تقطیع ہو جائے۔ سلاسل تصوف کی تاریخی تنقید بھی ضروری ہے اور زمانۂ حال کا علم النفس جو مسالہ تصوف پر حملہ کرنے کیلئے تیار کر رہا ہے اس کا پیشتر سے، ہی علاج ہونا ضروری ہے، میں نے اس پر کچھ لکھنا شروع کیا ہے۔ مگر میر بساط کچھ نہیں۔ یہ کام دراصل کسی اور کے بس کا ہے، میں صرف اس قدر کام کر سکوں گا کہ جدید مذاق کے مطابق تنقید کی راہ دکھلادوں۔ زیادہ تحقیق و تدقیق مجھ سے زیادہ واقف کار لوگوں کا کام ہے۔

آپ کے مکتوبات نہایت دلچسپ ہیں اور حفاظت سے رکھنے کے قابل نہ کہ ردّی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، میں نے ان کو خود پڑھا ہے اور بیوی کو پڑھنے کیلئے دیا ہے، یہ اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ

۱۔ یعنی بار بار۔ بتکرار

بعض مقامات سے مجھے اختلاف ہے اور یہ سب مقامات مسئلہ وحدت الوجود سے تعلق رکھتے ہیں، جب آپ اپنے مضمون میں زیادہ تشریح سے کام لیں گے۔ تو ممکن ہے کوئی اختلاف نہ رہے۔ کیونکہ مکتوبات میں ایک آدھ جگہ مسئلہ مذکور کی ایک ایسی تعبیر بھی ہے جس سے مجھ کو مطلق اختلاف نہیں اور نہ کسی مسلمان کو ہو سکتا ہے[1]

مثنوی کے متعلق ہندوستان اور یورپ کے مختلف ممالک میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تجزئے اور تبصرے شائع ہوئے جن میں بعض مثنوی کی موافقت اور بعض اس کی مخالفت میں تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اقبال مغربی خیالات کی ترویج کر رہا ہے۔ بعض نے کہا کہ اس مثنوی کے ذریعے مصنّف نے ایشاء والوں اور بالخصوص مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے۔ اور اس کے ہر لفظ میں سیاسی قوّت پنہاں ہے۔ لیکن اس زمانے میں وہ لوگ استثنٰی کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے مثنوی اسرار خودی کو اپنے صحیح سیاق و سباق میں سمجھ کر اس کی پذیرائی کی۔ میری مراد پروفیسر نکلسن سے ہے۔ جنھوں نے کہا کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد ﷺ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوزِ صداقت ہے اس کی ہم تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ اور خواجہ حافظ شیرازی کے خلاف جب بڑی لے دے ہوئی تو اقبال نے مصلحت کے تحت مثنوی کے دوسرے ایڈیشن سے یہ دونوں چیزیں حذف کر دیں۔ حالانکہ اسرار خودی کا دیباچہ اقبال کی فلسفیانہ بصیرت اور ان کے بسیط مطالعے پر شاہد ہے اور جسے سیّد فقیر وحید الدین نے "روزگار فقیر" جلد دوم میں علامہ کی نثری تحریر کا شاہکار قرار دیکر محفوظ کرنے

۱۔ سیّد مظفر حسین برنی۔ کلیات مکاتیب اقبال۔ جلد اوّل۔ ص۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲

غرض سے شامل کیا ہے، تو ظاہر بینوں نے اسے اقبال کی ہار سے تعبیر کیا لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ اقبال کی ہار میں ان کی جیت پنہاں تھی اور پھر مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اقبال کی اس مثنوی کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، اس مثنوی کا انگریزی منظوم ترجمہ کرتے ہوئے پروفیسر نکلسن نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

"اقبال کے احساسات ایک پرجوش مسلم کے احساسات ہیں۔ ان کا اسلام سے یہ عقیدت مندانہ تعلق دنیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے جس میں مسلمانوں کیلئے قومیت اور وطنیت کی رکاوٹیں حائل نہ ہو سکتیں۔ ان کا نصب العین ایک ایسے آزاد معاشرے کا قیام ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو ایمان اور ایقان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسُول پر مضبوط عقیدہ رکھتا ہو۔ اقبال نے اپنی مثنوی اسرار و رموز میں اس کی تعلیم دی ہے۔ ان کی دوربین نظر نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندوؤں میں عقلیت پرستی اور مسلمانوں میں تصوف نے قوموں سے قوتِ عمل چھین کر اس کو اپاہج بنا دیا ہے۔ حافظ پر ان کا انتقاد (حقیقتاً اسی تباہ کن تصوّر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے ایسے تصوّری فلسفے اور متصوفانہ شاعری سے شدید اختلاف کیا ہے، جس میں عمل کیلئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ [1]

ا۔ مجلّہ اقبال، جلد نمبر ۲۔ اپریل ۱۹۵۴ء، شمارہ نمبر۔ ۴۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں، محمد عبداللہ قریشی، معرکۂ اسرارِ خودی۔ ص۔ ۶۷

نظامِ عالم کے قیام میں خودی کی اساسی اہمیت

اس عنوان کے تحت اقبال نے خودی کا تعارف کرلیا ہے کہ خودی نظامِ عالم کا منبع یا سر چشمہ ہے اور تعینات وجود کی حیات کا تسلسل خودی کے استحکام پر انحصار رکھتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں خودی کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ اُو پیداست از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را

میکشد از قوّتِ بازوی خویش
تا شود آگاہ از نیروی خویش
خود فریبی ہائے اُو عینِ حیات
ہمچو گل از خون وضو عینِ حیات
بہریک گل خونِ صد گلشن کند
از پئے یک نغمہ صد شیون کند[1]

کائنات کے تمام مظاہر میں خودی کی شان جلوہ گر ہے۔ اس جہانِ رنگ و بو اور کائنات کی تخلیق خدا کی خودئ مطلق نے کی۔ اقبال کے نزدیک کائنات کا وجود یا پیکر ہستی خودی ہی کا نتیجہ ہے۔ ماسواء کا وجود خدا کی خودی سے سرزد ہوا ہے۔ خودی کا اثبات اس وجہ سے ہوا کہ خودی نے اپنا غیر پیدا کیا۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن لکھتے ہیں:۔

"اپنا اظہار خودی کی فطرت ہے اور وہ تخلیق کیلئے بیتاب ہے۔ وہ اپنے اثبات کے لئے نئے نئے پیکر بناتی ہے۔ اور ان غیر خود پیکروں سے ٹکرا کر اپنی قوت کا اہتمام کرتی ہے۔ غیر خودی سے آویزش کو شاعر نے لذّتِ پیکار کا نام دیا ہے جس سے خودی کی قوّت جِلا پاتی ہے۔ قوت خودی کا جوہر ہے۔ نظام حیات کا دارومدار خودی کی قوّت پر ہے۔ اسلئے زندگی کی عظمت قوّت ہی کی رہینِ منت ہے۔"[2]

۱۔ فلسفہ خودی کی تاسیس میں کہے گئے ان اشعار کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، المانوی فلسفی فشٹے سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ فشٹے کے فلسفہ کی رو سے عین ذات یا حقیقت وجود ایک انائے ساعی ہے۔ عمل اس کی فطرت ہے۔ اخلاقی عمل، اور پیکار اور نشوونما کیلئے اس نے اپنا غیر یا ماسواء پیدا کیا تاکہ امکان پیکار اور اس کے ذریعے سے امکان ارتقاء ممکن ہو جائے۔ لکھتے ہیں۔ "اس فلسفے کو جوں کا توں اقبال نے اپنے بلیغ و رنگین انداز میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ فلسفے کا خشک صحرا گلزار ہو گیا ہے۔" پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی، اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷

۲۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۲۴

اس جہاں کی زندگی زورِ خودی سے وابستہ ہے اور جس کی خودی جس قدر محکم ہو گی، اس کی زندگی اسی قدر استحکام کی حامل ہو گی[1] ایک قطرہ قوّت خودی سے اپنی تنک مایہ ہستی کو گوہر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس بادۂ بے پیکر جو اپنی خودی کو پختہ نہیں کرتا اور اپنے پیکر کیلئے جام کا رہین منّت ہوتا ہے، اسے اپنی بقا کیلئے ساغر کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح پہاڑ جب اپنی خودی سے بے بہرہ ہو گیا تو وہ صحرا میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور بقول اقبال ۔ شکوہ سنج جوشش دریا شود موج دریا جب تک آغوش بحر میں رہتی ہے وہ زورِ خودی کے باعث بحر کے دوش پر سوار ہو کر حکمران رہتی ہے۔ اقبال نے مختلف اشیاء کی حقیقت اور خودی سے ان کے ارتباط کی نہایت فکر انگیز، دلچسپ اور ٹھوس مثالیں پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر روشنی نے اپنی قوّت کو

۱۔ قرآن پاک میں اہل ایمان پر اپنی خودی کو مستحکم کرنے کا فرض عاید کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ. سورۃ المائدہ ۔ آیت ۱۰۵

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر فرض ہے خودی کی حفاظت۔ اگر تم ہدایت پر ہو، تو وہ شخص جو گمراہ ہے، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ تم سمجھو کہ اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا۔ (تاکہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے)۔

اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ اور قرآن میں انسان کو افلا تعقلون، افلا تدبرون جیسے الفاظ کے ذریعے تفکّر اور تدبّر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اقبال ایک باشعور اور حقیقی مسلمان کی طرح قرآن کی آیات پر تفکّر اور تدبّر کرتے رہے ہیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے نزدیک اقبال کے فلسفہ خودی کا سنگِ بنیاد قرآن کی یہی آیت شریفہ ہے۔ لکھتے ہیں۔ "غالباً ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک دن حضرت علامہ سے دریافت کیا کہ آپ کے فلسفہ خودی کی قرآنی بنیاد کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ ۱۹۱۱ء میں جب میں نے قرآن کی اس آیت میں تدبّر کیا ۔۔۔۔۔ تو یہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہو گئی۔ کہ ہر مسلمان پر اپنی خودی (کا) استحکام فرض ہے۔ پس میں نے اسی آیت شریفہ کو اپنے فلسفہ خودی کا سنگ بنیاد بنایا۔"

پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ اسرار خودی مع شرح۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲

یکجا کر کے دید کی شکل اختیار کی اور خواہش دید نے آنکھ کو بصیرت عطا کی۔ سبزے نے اپنی ذات سے نمو پانے کی قوت پیدا کی تو اپنی قوت سے گلشن کے سینے میں شگاف پیدا کیے۔ اس کے برخلاف شمع نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو پابہ زنجیر کر دیا۔ وہ اس طرح کہ خود گدازی کا شعار اپنا کر خود سے بیگانہ ہوئی اور اپنی ہی آنکھوں سے اشک سوگوار کی مانند گر کر بہنے لگی۔

گر بہ فطرت پختہ تر بودی نگین
از جراحت ہا بیا سودی نگین
می شود سرمایہ دار نام غیر
دوش از مجروح بار نام غیر

زمین نے احساس خودی کی بدولت اپنی ہستی میں استحکام پیدا کیا کہ چاند مسلسل اس کا طواف کرنے کا پابند ہوا۔ سورج نے اپنی ہستی میں زمین کی نسبت زیادہ استحکام پیدا کیا اور زمین کو مسحور کر کے اسے اپنے طلسم میں اسیر کر رکھا ہے۔ کائنات کی مختلف اشیاء کی حقیقت اور خودی سے ان کے ارتباط کی فکر انگیز اور دلچسپ مثالیں دیکر علامہ نے یہ نتیجہ بر آمد کیا ہے کہ زندگی کی قدر و قیمت کا انحصار قوت پر ہے اور خودی جب قوتوں سے مالا مال یا سرمایہ دار ہو جاتی ہے تو زندگی کی ندی سے بحر ناپیدا کنار کھول دیتی ہے۔ اقبال نے قوت کو زندگی کی ایک لازمی صفت گردانا ہے اور فلسفۂ قوت اور مذہب میں ایک خاص ربط پیدا کیا ہے۔

خودی کی حیات مقاصد کی تخلیق اور تولید سے وابستہ ہے۔

اقبال کے نزدیک حیات خودی کا انحصار مقصد آفرینی پر ہے اور مدعایا مقصد آفرینی سے انسان کی زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ مدعا ہی کاروانِ زندگی کا دِرا ہے۔ زندگی جستجو میں مضمر ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنے دل میں آرزو زندہ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے ؎

تانہ گردد مشت خاک تو مزار

یہ آرزو ہی ہے جس پر خودی کی تگ و تاز کا انحصار ہے۔ آرزو سے خالی انسان کی حیثیت ایک مُردے کی سی ہے۔

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات
غیر حق میرد چو اُو گیرد حیات
چون ز تخلیقِ تمنّا باز ماند
شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائی خودی
موجِ بیتابی ز دریای خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد
شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

انسان کے اندر لذّتِ دیدار کی خلش پیہم تھی جس کی بدولت اس نے دیدۂ بیدار کی شکل اختیار کی اور اطمینان حاصل کیا۔ کبک کو بھی شوخیٔ رفتار نے پاؤں عطا کیے۔ بلبل کے یہاں سعیٔ نوا نے منقار (چونچ) کی صورت اختیار کی

جب بانسری اپنے نیستان سے جدا ہو گئی۔ تو نغمے نے بھی زندان سے رہائی حاصل کی۔

عقل ندرت کوش و گردون تاز چست
ہیچ میرانی کہ این اعجاز چست

آرزو زندگی کو سرمایہ دار بنادیتی ہے اور اس کی قدر و قیمت کا یقین کرتی ہے۔ اقوام کی زندگی ان کے رسوم و آئین، ان کے علم و حکمت ان سب کو آرزو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اظہار کی مدد سے دل کی دنیا سے نکل کر ایک مجسم صورت اختیار کی ہے۔ ہمارے دست و دندان، دماغ، آنکھیں اور کان، اور ہمارا فکر و تخیل اور شعور و فہم وہ آلات ہیں جو ہم نے زندگی میں عالم پیکار میں اپنے دفاع کیلئے ترتیب دیے ہیں۔ علم و فن سے آگہی ہرگز مقصود نہیں۔ علم حفظِ زندگی کا سامان ہے اور خودی کی تقویم کا سبب ہے۔ اقبال نے علم و فن کو پیش خیزان حیات کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور انسان کو ایک ایسے مقصد کی تخلیق کرنے کی تلقین کی ہے جو سحر کی مانند تابندہ ہو۔ اور ماسواء کے حق میں آتش سوز ہو۔ ایسا مقصد جو باطل کو غارت کر کے دنیا میں ایک فتنۂ محشر برپا کر دے۔ مقاصد کی تخلیق انسان کو زندہ رکھتی ہے اور اسی سے شعاع آرزو تابندہ رہتی ہے۔

ای ز راز زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدی مستانہ خیز
مقصدی مثلِ سحر تابندۂ ی
ماسوی را آتش سوزندہ ی
مقصدی از آسمان بالا تری
دلربای، دلستانی، دلبری

باطل دیرینہ را غارتگری
فتنہ در جیبی سراپا محشری
ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عشق و محبت خودی کے استحکام کا ذریعہ ہے۔

اقبال نے خودی کو ایک نقطہ نور کے نام سے یاد کیا ہے۔ نقطہ نور جس کا نام خودی ہے۔ انسان کے پیکر خاکی میں شرارِ زندگی کی مانند ہے۔

یہ نقطہ نور عشق و محبت سے استوار ہوتا ہے اور عشق و محبت ہی کی بدولت اس کی مضمر صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اقبال نے عشق کی بے باکی، اس کی غیر معمولی قوتوں اور عظمت کو خراج پیش کیا ہے۔

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آب حیوان تیغِ جوہر دار عشق
از نگاہِ عشق خارا شق بُود
عشقِ حق آخر سراپا حق بود

عشق کی غیر معمولی قوتوں کا ذکر کرنے کے بعد اقبال اپنے مخاطب کو مسلکِ عشق اختیار کرنے اور چشم نوحؑ اور قلب ایوبؑ پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مشتِ خاک کو کیمیا میں بدل دینے کیلئے کسی کامل کے آستان پر بوسہ زن ہونا ضروری ہے۔ انسان مولانا روم کی طرح اپنی شمع کو فروزاں کرلے اور خرمن

روم کو مولانا شمس تبریز کی آگ سے راکھ کر دے۔ انسان اگر واقعی دیدۂ بینار کھتا ہے تو اس کے دل کے اندر ایک ہی معشوق پنہاں ہے، جس کے عاشق خوب سے خوب تر ہیں، جس کے عشق کی بدولت عشاق کے دل توانا ہیں، جس کا عشق خاک کو ہم دوشِ ثریا کر دیتا ہے۔ وہ ذات اقدس ہے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ مسلمان کو عشقِ مصطفیٰؐ ہی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دنیا میں مسلمان کی آبرو نام مصطفیٰؐ ہی کی بدولت ہے۔

در دل مومن مقام مصطفیٰ است
آبروئے ماز نام مصطفیٰ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ رابیت الحرم کا شانہ اش
کمتر از آنی ز اوقاتش ابد
کا سب افزائش از دانش ابد
بوریا ممنون خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیر پائ امتش
در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

محمد مصطفیٰؐ کی ذات پاک میں اقبال جلال اور جمال دونوں کو ہم آہنگ پاتے ہیں، یہ وہ عظیم ترین ہستی ہے جن کی تیغ آبدار نے نسلِ سلاطین کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور دنیا کی خاطر آئینِ نو کا آغاز کیا۔ اس بے بدل اور لاثانی ہستی نے دنیا کا دروازہ دین کی چابی سے کھولا اور حقیقی معنوں میں مساوات کا پیکر بن کر ادنیٰ اور اعلیٰ کی تفریق مٹا دی۔ اس کے بعد آنے والے اشعار میں سردار حمان کی بیٹی کو قید

کرنے اور پھر اسے شاہ امم ﷺ کے سامنے لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سردار طے حمان کی بیٹی برہنہ اور پابہ زنجیر تھی اور مارے حیا کے اس نے اپنی گردن جھکائے رکھی تھی۔ جب شاہ امم ﷺ کی نگاہ سردار طے حمان کی بیٹی پر پڑی تو آپ ؐ نے فوراً اپنی ردائے مبارک اس کے بدن پر ڈال دی۔ اقبال کے نزدیک ہم آج سردار طے حمان کی بیٹی سے عریاں تر ہیں ۔ پیش اقوام جہاں بے چار دریم

اس کے بعد اسی ذاتِ اقدس کو روزِ محشر میں ہمارا اعتبار کہا گیا ہے اور اس جہاں میں بھی وہی ہماری آبرو کا پاسبان اور نگہبان ہے۔ آپ ﷺ کا لطف و قہر پوری دنیا کے حق میں سراپا رحمت ہے۔ آپ ﷺ ہی کی بدولت حسب و نسب کا امتیاز مٹ گیا۔ محمد مصطفےٰ کی سیرت پاک کے چند پہلوؤں اور عظمت کا ذکر کرنے کے بعد مسلمان سے آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اقبالؔ محبوب کی تقلید کو عشق کی بنیادی صفات میں سے ایک صفت قرار دیتے ہیں۔ محبوب کی تقلید کے سلسلے میں انہوں نے ممتاز ترین صوفی بزرگ بایزید بسطامیؒ کی حیات سے ایک مثال پیش کی ہے۔ جو نبی اکرم ﷺ کی تقلیدِ کامل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے خربوزہ کھانے سے زندگی بھر اس لئے اجتناب کیا کیونکہ انہیں یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ حضور ﷺ نے اس پھل کو کس طریقے سے کھایا ہے۔

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

اقبالؔ کے نزدیک عاشق اپنے محبوب کی تقلید میں اس قدر استحکام حاصل کرلے کہ کائنات کی مخفی اور ظاہر قوتوں کی تسخیر اس کا شیوہ بن جائے۔ خدائی قوتوں سے مسلح ہو کر ہوس کے بتوں کو پاش پاش کردے۔ مسلمان قوت

عشق سے پہلے ایک لشکر کو جمع کرے پھر شوق سے کوہِ فاران پر جلوہ گر ہو جائے تا کہ اس پر خدا کا فضل و کرم نازل ہو اور وہ حقیقی معنوں میں نائب حق کہلانے کا مستحق ہو۔

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
هم به بحر اندر نگوں پیمانہ باش

خودی سوال کرنے سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ جس طرح عشق و محبت اور مقاصد کی تخلیق و تولید خودی کو استحکام عطا کرتے ہیں اسی طرح سوال خودی کو کمزور و ناتواں کر دیتا ہے۔

ای فراهم کرده از شیراں خراج
گشته ئ روبہ مزاج از احتیاج

احتیاج یا ناداری انسان کو روبہ مزاج کر دیتی ہے۔ خستگی کا سبب کیا ہے؟ خستگی کا سبب ناداری ہے اور دکھ درد تہی دستی کی بیماری کے باعث ہے۔ سوال انسان سے اس کی رفعتِ فکر چھین کر اس کے خیالات میں پستی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے تخیل کے دیے کو گل کر دیتا ہے۔

از خم ہستی می گلفام گیر
نقد خود از کیسہ ی ایام گیر

اقبالؔ نے منتِ غیر سے محفوظ رہنے کی خاطر حضرت عمرؓ کی بے منتِ غیر جینے والی زندگی کے ایک واقعے کی طرف نہایت سبق آموز اشارہ کیا ہے کہ آپؓ ایک مرتبہ اونٹ پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ کہ دفعتاً ہاتھ سے کوڑا نیچے گر گیا۔ بجائے اس کے کہ کسی سے تازیانہ اٹھانے کو فرمائیں، آپؓ خود اونٹ سے نیچے

اترے اور تازیانہ اٹھایا۔ اقبال اپنے مخاطب سے حضرت عمر فاروقؓ کی طرح بے منّتِ غیر زندگی جینے کی تلقین کرتے ہیں۔

خود فرود آ از شُتر مثلِ عمرؓ

الحذر از منّتِ غیر الحذر

انسان کب تلک منصب کے حصول کی خاطر دریوزہ گری کرے۔ اگر انسان کی فطرت بلند ہو تو وہ آسمانوں سے بھی بلند ہو گی۔ اور غیر کا احسان مند ہو کر وہ خوار و نژند ہو جاتی ہے۔ مانگنے سے ایک مفلس خوار ہو جاتا ہے اور گدائی سے گدا اور زیادہ نادار ہو جاتا ہے۔ سوال کرنے سے خودی کا تار و پود بکھر کر منتشر ہو جاتا ہے اور یہ نخل طور بے تجلّی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اقبالؔ انسان کو تلقین کرتے ہیں کہ اے مرخندہ فال اپنی ہستی کو برباد مت کر۔ انسان کتنا ہی مفلس اور نادار کیوں نہ ہو جائے اور اگر بد قسمتی کا طوفان بھی اسے لے ڈوبے۔ تو بھی اسے اپنی روزی منّتِ اغیار سے حاصل نہ کرنی چاہیے۔ انسان چشمۂ خورشید سے پانی طلب نہ کرے تاکہ روزِ حشر کو اسے رسول اللہ ﷺ کے سامنے خجل نہ ہونا پڑے۔ اقبالؔ نے اس بات کو چاند کی مثال سے سمجھایا ہے کہ چاند روشنی کیلئے سورج سے بھیک مانگتا ہے، نتیجے کے طور پر سورج کا احسان مند ہونے نے اس کے دل کو داغدار کر دیا ہے۔ انسان کو ہمت حق پر فلک سے برسرِ پیکار ہونا چاہیئے تاکہ وہ ملّتِ بیضا کا محافظ بن سکے۔

آنکہ خاشاک بتان از کعبہ رفت

مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

حضور پرنور ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔ الکاسِبُ حَبِیبُ اللّٰہ۔ یعنی مزدور اللہ کا دوست ہے۔ اقبالؔ نے انسان کو کسی کا احسان نہ لینے اور اپنی خودی کی حفاظت

کرنے کی تلقین کی ہے۔ حیف ہے اس شخص پر جس نے اپنی روزی کسی کا احسان لیکر حاصل کی اور اس کی گردن احسان کے بوجھ تلے دب گئی۔ اس کے برخلاف وہ شخص بڑا ہی خوش بخت ہے جو چلچلاتی دھوپ میں خضر سے بھی اپنی پیاس بجھانے کے لئے چلو بھر پانی کا جام تک طلب نہ کرے۔ ایسا شخص اپنی تہی دستی کے باوجود اپنی خودی کو کسی بھی قیمت پر داؤ پر نہیں لگاتا، بلکہ اسے ہر حال میں بلند تر اور بیدار رکھتا ہے۔ اگر مانگے سے قلزم بھی مل جائے تو اسے آگ کے ایک سیلاب سے کم نہیں سمجھنا چاہیئے اور اگر خود ہی شبنم کا ایک قطرہ مل جائے، وہ گوہر نایاب سے بھی بہتر ہے۔ اقبال اپنے مخاطب سے حباب سے غیرت مردانہ اور خودداری کا سبق سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں جو سمندر میں رہ کر بھی اپنا پیمانہ نگوں نسار رکھ کر اپنی خودداری اور غیرت مردانہ کو برقرار رکھتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے الفاظ میں "خودی کا اقتضا تو یہ ہے کہ انسان بحرِ حیات میں نگوں پیمانہ رہے"[1]

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلّی نخلِ سینائے خودی
وائے بر منّت پذیرِ خوانِ غیر
گردنش خم گشتہ احسانِ غیر
چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ھم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

زیرِ بحث عنوان کے تحت آنے والے اشعار میں اقبال نے انسان کو اپنی قوتِ بازو سے رزق حاصل کرنے اور دوسروں کا احسان نہ لینے کی تاکید کی ہے کیونکہ انسان

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ روحِ اقبال۔ ص۔ ۱۹۱

خود سعی نہ کر کے فطری طور پر دوسرے کا محتاج ہو جاتا ہے اور احتیاج کے نتیجے میں اسے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے جو اس کی خودداری اور غیرتِ مردانہ کیلئے سمِ قاتل ہے۔

خودی عشق و محبّت سے مستحکم ہو کر کائنات کے قوائے ظاہرہ و مخفیہ کو مسخّر کر لیتی ہے۔

جب عشق و محبت کی بدولت خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے تو یہ نظامِ عالم کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے یعنی کائنات پر حکمران ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ نے آسمانوں پر ستاروں کے نقش و نگار کو خودی کی شاخ سے کھلے ہوئے بے شمار غنچوں سے تعبیر کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی عشق سے محکم ہو کر نظامِ عالم کی خفیہ اور ظاہری قوّتوں کو کس طرح مسخر کر لیتی ہے۔ اس کی صراحت علامہ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدس سے ماخوذ شق القمر اور معروف بزرگ حضرت بو علی قلندر پانی پتی کی زندگی سے اخذ کئے گئے دو الگ الگ واقعات کے ذریعے کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ منیٰ میں تھے کہ کفارِ مکہ کے معجزہ طلب کرنے پر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہو گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ گواہ رہیں۔ اقبال شق القمر کے اس واقعہ کو اس شعر میں بیان کرتے ہیں۔

پنجہ او پنجہ حق میشود
ماہ از انگشتِ او شق میشود

اس شعر میں تلمیح ہے شق القمر کے مشہور و معروف معجزہ کی طرف، جس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں آیا ہے۔

اقتربت الساعتہ والنشق القمر۔ یعنی مقررہ ساعت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا۔

اقبال کے نزدیک اپنی خودی کو محکم کرنے والے شخص کے سامنے دارا اور جم جیسی بڑی بڑی اور قوی شخصیتیں اپنا سر خم کر دیتی ہیں۔ اس بیان یا دعوے کے ثبوت میں حضرت شاہ بو علی قلندر پانی پتی، جن کا شہرہ ہندوستان میں کافی دور دور تک ہے کی حیات سے ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مردان خدا اگرچہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتے ہیں، لیکن ان کی قوت کے سامنے وقت کے حاکم بھی لرزہ بر اندام ہوتے ہیں۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک روز حضرت شاہ بو علی قلندر کا ایک مرید اپنے پیر قلندر صاحب کی دُھن میں سرشار بازار کی طرف جا رہا تھا۔ اسی دوران عاملِ شہر گورنر کی سواری بازار سے گذر رہی تھی۔ مرید بیچارا دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنی دھن میں مست گورنر کی سواری کے سامنے آکر کے کھڑا ہو گیا۔ اس پر چوبدار نے متکبرانہ انداز میں درویش کے سر پر عصا دے مارا۔ عامل کی راہ سے درویش بڑا آزردہ اور افسردہ خاطر ہو کر چلا گیا اور حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں فریادی ہوا۔ درویش کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری دیکھ کر شیخ اس قدر برہم ہوئے کہ ان کی باتوں سے آگ کا ایک طوفان برپا ہوا۔ انہوں نے برافروختہ ہو کر اپنے منشی کو حکم صادر فرمایا کہ قلم لیکر اس فقیر بے نوا سے جانب سلطان فرماں لکھ دے کہ تیرے خادم کو ترے عامل نے عصا کیا مارا، اس نے تو اپنی زندگی کے خرمن میں آگ لگائی ہے۔ اگر تو اپنی حکومت کا خواہاں ہے تو اسے برطرف کر دے ورنہ تجھ سے یہ تخت و تاج چھین کر کسی دوسرے کو سونپ دیا جائیگا۔ جیسے ہی اس مرد حق آگاہ کا فرمان سلطان کو موصول ہوا۔ وہ سراپا لرزہ بر اندام ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور

غم والم کے آثار صاف طور پر نمودار ہوئے۔ پہلے اس نے عامل کے گلے میں ایک زنجیر ڈال دی، پھر قلندر سے معافی کی تدبیر کی۔ حضرت امیر خسرو کو سلطان علاؤ الدین خلجی کی جانب سے بہر سفارت منتخب کیا گیا، جب اسے بارگاہ حضرت بو علی قلندر میں باز یابی ہوئی تو چن کے ساتھ اپنی ایک غزل سنائی۔

از نوائے شیشہ ی جانش گداخت

چونکہ درویش نے اپنی خودی کو کہساری مانند پختہ کر دیا تھا

قیمت یک نغمہ ی گفتار بود

آخری شعر میں اقبال کے نزدیک مردانِ خدا کو تکلیف پہنچانا، ایزا رساں یا موذی کا خود اپنے ہی حق میں آتشِ سوزان کا سامان کرنے کے مترادف ہے۔

نیشتر بر قلبِ درویشان مزن

خویش را در آتشِ سوزان مزن

نفیٔ خودی کا مسئلہ مغلوب اقوام کی اختراع ہے جس کی آڑ لیکر اقوام غالبہ کے اخلاق میں ضعف پیدا کیا جاتا ہے۔

نفیٔ خودی کا مسئلہ مغلوب اقوام کی اختراعات سے ہے تا کہ اس کی مدد سے مخفی طور پر اقوام غالب کے اخلاق میں ضعف پیدا کیا جائے۔ اقبال نے اس مسئلہ کو ایک دلچسپ حکایت کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ حکایت ایک مرغزار میں آباد کچھ بھیڑوں اور جنگل کے شیروں پر مشتمل ہے۔ بھیڑیں جنگل میں کچھ مدت تک بڑی بے فکری کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہیں۔ بالآخر ایک روز جنگل کے شیر ان سے واقف ہو گئے اور ان پر شب خون مارنے کیلئے تاک میں رہ کر بھیڑوں کے خون سے پورے مرغزار کو رنگین بنانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک بکری نہایت ہی عقلمند تھی، اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ پند و وعظ سے

گوسفند کو خُوئے گرگ کرنا ممکن نہیں البتہ شیر نر کو بھیڑ کر دینا ضرور ممکن ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے شیروں کو نفیٔ خودی کا درس دینا شروع کر دیا۔

نعرہ زد ای قوم کذّاب اشر
بے خبر از یوم نحس مستمر

عقلمند بکری نے شیر سے اپنی زندگی میں استحکام پیدا کرنے کیلئے نفیٔ خودی اختیار کرنے کی تلقین کی، اسے عاجزی اور فروتنی اختیار کرنے کی ہدایت کی، اور کہا کہ نیک روحوں کی غذا چارہ اور گھاس ہے۔ گوشت خوری ترک کر دینے سے بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو جاؤ گے، جب کہ تیری یہ تیزیٔ دندان ایک روز تجھے رُسوا کر دے گی اور تمہاری قوّتِ ادراک زائل ہو جائے گی۔ ضعیفوں کا مستقر جنّت ہے اور قوّت کی بدولت خسارے میں پڑ جاؤ گے۔ عظمت و سطوت کی جستجو قوّت کے حق میں شر ہے، دنیا میں امارت سے تنگ دستی بہتر ہے۔ اس لئے بکریوں کو ذبح کرنے کی بجائے اپنی خودی کو ذبح کرو۔ زندگی ایک ناپائیدار شئے ہے۔ اس لئے اس سے دل مت لگاؤ۔ دیکھ لو سبزہ پامال ہونے کے باوجود سبز ہی رہتا ہے۔

تو بہ از اعمالِ نا محمود کن
ای زیاں اندیش فکرِ سود کن
ہر کہ باشد تُند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفیٔ خودی است
روح نیکاں از علف یابد غذا
تارک اللحم است مقبولِ خدا
جستجوی عظمت و سطوت شر است
تنگ دستی از امارت خوشتر است

برق سوزاں در کمین دانہ نیست
دانہ گر خرمن شود فرزانہ نیست
ذرّہ شو صحرا مشو گر عاقلی
تاز نورِ آفتابی بر خودی
ای کہ می نازی بذبح گو سفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

شیروں کی جماعت بھیڑوں کے شکار کی خاطر سخت کوشی کے عمل سے خستہ ہوچکی تھی۔ اس لئے اسے یہ مسلکِ گوسفندی (جو تن آسانی اور کاہلی پر مبنی تھا) بہت مرغوب خاطر ہوا چنانچہ اس مسلک کو اختیار کر ہی لیا۔ سخت کوشی کا مسلک ترک کر دینے سے اور مسلکِ گوسفندی اختیار کرنے کے نتیجے میں گھاس کھانے سے شیروں کی تیزیٔ دندان جاتی رہی۔ ہیبتِ چشم شرار افشاں بھی نہ رہی۔ ان چیزوں کے نتیجے میں اقتدار و عزمِ استقلال بھی رخصت ہو گیا۔ اعتبار عزّت و اقبال سب کچھ ختم ہوگیا۔ آہنی پنجوں میں وہ زور بھی نہ رہا۔ اپنے مسلک کو ترک کرنے سے ان پر مردنی سی چھاگئی۔ جسم کی قوّت ختم ہو جانے سے ان کے یہاں خوف جان میں اضافہ ہونے لگا۔ سرمایۂ ہمت رخصت ہو گیا۔ بے ہمتی سے سینکڑوں امراض نے جنم لیا۔ کوتاہ دستی، بیدلی اور دوں فطرتی پیدا ہوئی۔ شیر بیدار کو بھیڑ کے فسوں نے خفت کر دیا اور اس نے اپنے انحطاط کو تہذیب سے تعبیر کیا۔

اس حکایت کے پردے میں اقبالؔ نے دکھایا ہے کہ غالب اور مغلوب دونوں اپنی اپنی بقاء کیلئے کس طرح راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ ضعیف یا مغلوب اپنے تحفظ کیلئے حیلہ جوئی اور بہانہ تراشی سے کام لیتا ہے۔ اس طرح غلامی میں

تدبیر کرنے کی قوت تیز تر ہو جاتی ہے۔ نفی خودی کا فلسفہ اپنانے سے جو منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح ہیں:۔

"نفی خودی کا فلسفہ اپنانے سے دل تقاضائے عمل کے قابل نہیں رہتا۔ عزم واستقلال رخصت ہو جاتے ہیں اور اقتدار واعتبار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قوت سے محرومی خوفِ جان اور پستیِ ہمت کا باعث بنتی ہے اور پھر روبہ زوال قومیں جسمانی اور روحانی تنزل کو تہذیب کے نام سے یاد کرنے لگتی ہیں"[1]

حکیم افلاطون اور حافظ شیرازی کے تخیّلات سے احتراز کرنا واجب ہے۔ تصوف اور ادبیات اقوام اسلامیہ نے ان کے افکار سے گہرا اثر قبول کیا۔

اقبال نے یونان کے حکیم افلاطون پر جو تنقید کی ہے وہ مغربی مفکر حکیم نطشے کے خیالات کو پیش نظر رکھ کر یا ان کے زیرِ اثر کی ہے۔ نطشے کا خیال ہے کہ افلاطون اور سقراط دونوں حکماء کے زیر اثر جو فلسفہ اور تہذیب اور فن لطیف پیدا ہوئے ہیں، وہ سب انحطاطی ہیں اور جب تک ان کی بیخ کنی نہ کی جائے، تب تک اس پھڑکتی اور دھڑکتی ہوئی فطرت کی اصل کو سمجھنا دشوار ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:۔

"افلاطون اس عالم محسوس سے ماورئی ایک ازلی اور ابدی غیر متغیر عالم عقلی کا قائل تھا۔ اس متحرک اور متغیر اور محسوس زندگی کو مقابلتہً غیر اصلی سمجھتا تھا۔ اس کا اثر عیسوی اور اسلامی فلسفے اور تصوف پر بہت پائیدار اور گہرا ہے۔ اسلامی تصوف میں جو افکار بعض اکابر صوفیاء کے ساتھ منسوب ہیں وہ حقیقت میں یا

ا۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبالؔ کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۱۳۰

افلاطون کے افکار ہیں یا اس کے افکار کے مشتقات ہیں۔ محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم" کا بہترین حصہ اسی سے ماخوذ ہے اور فلسفۂ اشراق کی بنیاد بھی افلاطونی ہے۔ اسلامی دینیات اور تصوف میں یہ چیزیں اس طرح سما گئیں اور سموئی گئیں کہ اب ان کو اصل اسلام سے علیحدہ کرنا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا ہے۔[1]

افلاطون اعیان یا تصورات ہی کو حقیقی وجود تسلیم کرتے ہیں چنانچہ اُن کے نزدیک کائنات کی تمام اشیاء انہیں اعیان کی ناقص نقلیں ہیں، وہ عالم اعیان ہی کو حقیقت قرار دیتے ہیں اور یہ عالم اجسام و صور محض اس کا عکس یا عالم مجاز ہے۔ اسی سبب کے تحت اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان کی سخت تنقید کی ہے۔ "اسرار خودی" میں "در معنی اینکہ افلاطون یونانی کہ تصوف و ادبیات اقوام اسلامیہ از افکار او اثر عظیم پذیرفتہ بر مسلکِ گوسفندی رفتہ است و از تخیلات او احتراز واجب است" کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ افلاطون یونانی کے افکار نے تصوف اور اقوام اسلامیہ کے ادبیات کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ چنانچہ اس کے افکار سے احتراز کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان کی شدید مخالفت اس لئے کی ہے کیونکہ یہ انسان کو رہبانیت کی طرف لے جاتا ہے جب کہ رہبانیت اسلام کی ضد ہے۔ قرآن کی رُو سے یہ دنیا فریب نظر یا دھوکہ نہیں بلکہ اسے انسان کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور انسان کی تخلیق اس لئے کی گئی ہے کہ وہ کرۂ ارض پر اللہ کا نائب بن کر رہے لیکن جب انسان اس دنیا کے ہنگامہ کا منکر ہو جائے اور اسے فریب نظر قرار دے تو اسے مسخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبال نے افلاطون کو راہب دیرینہ یا راہب اوّل کے لقب سے یاد کر کے اس کا تعلق گوسفندوں کے قدیم گروہ سے بتایا ہے۔

۱۔ پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۰۸

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گفت بِرّ زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرمانرواست
جامِ او خواب آور و گیتی رُباست
فکرِ افلاطون زیان را سود گفت
حکمت او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جان او وارفتہ معدوم بود
منکرِ ہنگامہ ی موجود گشت
خالقِ اعیان نا مشہود گشت
زندہ جان را عالم امکان خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیان خوش است
راہب ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغائے این عالم نداشت
دل بسوز شعلہ ی افسردہ بست
نقش آں دنیا ی افیون خوردہ است
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے الفاظ میں۔ ”علامہ کو شکوہ ہے کہ افلاطون آج بھی

ہمارے تخیلات پر حاوی ہے، حالانکہ اس کے افکار قوت عمل اور طاقت سے محرومی کا سبق دیتے ہیں۔ افلاطون کی نظر میں تو زندگی کا راز موت میں پوشیدہ ہے اور عالم اسباب محض ایک افسانہ ہے۔ ذوقِ عمل سے محروم ہونے کی وجہ سے اس نے نیستی کو ہستی اور ہستی کو نیستی قرار دیا۔ بقول علامہ اس کے فلسفہ نے محض خواب و سراب کا تانا بانا بُن کر زندہ حقیقتوں کر نظر انداز کر دیا۔ اس کے دوررس اثرات نے متاثرہ قوموں پر گہرا تخریبی اثر ڈالا اور انہیں ذوقِ کردار سے محروم کر دیا"[1]

بعض لوگوں کے خیال میں افلاطون اس شدید تنقید کا مستحق نہ تھا۔ جیسا کہ ملک حسن اختر "دائرہ معارف اقبال" میں لکھتے ہیں:۔

" افلاطون کی کتاب جمہوریہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون اس سخت تنقید کا مستحق نہ تھا کیونکہ اس نے بھی بہتر زندگی کیلئے عمل کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے"[2]

یونانی حکیم افلاطون پر تنقید کرنے کے باوجود اقبال اس فلسفی کے اثرات سے یکسر محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ ادب میں مقصد پسندی کے حامی فن کاروں کے یہاں افلاطون کے اصولِ فن کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ افلاطون کے نزدیک آرٹ (فن) کو اخلاق کا تابع ہونا چاہئے اور فن کی تخلیق مملکت کے مجموعی مفاد کے مطابق ہونی چاہیے۔ اقبال بھی فن کی افادیت اور مقصدیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک فن کا مقصد اس زندگی کے ارتقاء سے عبارت ہے جو فقط چند نفوس کی حامل نہ ہو" بلکہ اس کا رشتہ زندگی کی بنیادی قدروں سے ہو اور ایسی قدروں کی حامل وہی زندگی ہو سکتی ہے جو انفرادیت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ

۱۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۳۰

۲۔ ملک احسن اختر۔ دائرہ معارف اقبال۔ ص۔ ۵۷

کر اجتماعی زندگی کا تابناک جزو بن جائے۔ ظاہر ہے یہ چیز عام نہیں ہوتی بلکہ مخصوص افراد ہی ایسی زندگی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان مخصوص افراد میں اعلیٰ فن کار کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کا فن صرف اسی کی زندگی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ فکر کی سطح پر دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اسی لئے اقبالؔ فن کا مقصد ابدی زندگی کا سوز پیدا کرنا سمجھتے ہیں"[1]

یونانی حکیم افلاطون پر تنقید کرنے کے بعد اقبالؔ جب اسلامی ادبیات کی طرف آتے ہیں تو انہیں عجمی ادبیات میں بھی وہی رنگ ملتا ہے جسے وہ انحطاط کی علّت اور اس کا معلول قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فارسی کے مقبول ترین غزل گو شاعر خواجہ شمس الدین محمد حافظؔ شیرازی کو عجمی ادبیات کا نمونہ سمجھ کر اسے بھی اپنی شدید تنقید کا ہدف بناتے ہیں۔ خواجہ حافظؔ پر اس شدید تنقید کا جواز پیش کرتے ہوئے اقبال بتاتے ہیں کہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ قوائے حیات میں ضعف پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے حافظؔ کے کلام کو قوم کے حق میں مضرت رساں قرار دینے کا سبب بتاتے ہوئے ڈاکٹر عبدالشکور احسن لکھتے ہیں:۔

"حافظ کے کلام میں ایک طلسماتی دلکشی اور سحر آفرین حسن ہے لیکن اس میں زیادہ توجہ حدیث مطرب دمے کی طرف ہے۔ اس کے ہاں عافیت جوئی، تلخ حقایق سے گریز، اور عزلت نشینی کی طرف نہایت قوی رجحان ہے۔ بعض جگہ وہ نہایت واضح اور قطعی انداز میں انسانی کوششوں کی بے حاصلی کا ذکر کرتا ہے۔۔۔۔۔ زندگی کے سفاک حقایق سے گریز اور دور آشوب میں صراحی مے ناب پر اکتفا کی روش ایک ایسے مسلک زندگی کی آئینہ دار ہے جو فلسفۂ خودی کے

۱۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ (مرتب) اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں۔ جمیل احمد۔ اقبالؔ اپنے نظریۂ فن کی روشنی میں۔ ص۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲

پیغامبر کیلئے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا"[۱]

اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں حافظ شیرازی کی تنقید میں ۳۵۔ اشعار ملتے ہیں جو مثنوی کے دوسرے ایڈیشن سے اقبال نے مصلحت کے تحت نکال دیے۔ اب یہ اشعار روزگار فقیر (مرتبہ سید فقیر وحید الدین) میں درج ہیں۔ یہاں پر صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او
از دو جام آشفتہ شد دستار او
آن فقیہہ ملتِ مے خوارگاں
آں امام اُمتِ بے چارگاں
گوسفند است و نو آموخت است
عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربا یہائے او زہر است و بس
چشمِ او غارتگری شہر است و بس
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

اور پھر۔

مار گلزارے کہ دارد زہر ناب
صید را اوّل ہمی آرد بخواب

۱۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔۳۱

اقبالؔ اس خواب آور فنِ لطیف کے شدید مخالف تھے۔ اس طرح کی شدید تنقید حافظؔ کے پرستاروں میں سخت برہمی پر منتج ہوئی۔ حافظؔ کے مدّاحوں نے اقبالؔ کی اس تنقید کی بڑی مخالفت کی۔ اقبالؔ اپنے بیانات کے ذریعے اپنے احباب کے نام لکھے گئے خطوط میں حقیقت حال کی وضاحت کرتے رہے۔ ۱۱، جون ۱۹۱۸ء کو لسان العصر اکبر الہ آبادی کو لکھا:-

"میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا۔ اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ حافظؔ کی ولایت سے اس تنقید کا کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ ان کی شخصیت سے۔ نہ ان اشعار میں مئے سے مراد وہ مئے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں، بلکہ اس سے وہ حالت سکر (Narcotic) مراد ہے جو حافظؔ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔"[1]

بالآخر حافظؔ (جنہیں لسان الغیب کی حیثیت حاصل تھی) کے پرستاروں اور عقیدت مندوں کی برانگیختگی اور برہمی دیکھ کر اقبال نے اپنے والد شیخ نور محمد کے مشورے[2] اور مصلحت کوشی کے پیش نظر اقبال نے

۱۔ شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص۔ ۵۴

۲۔ "علامہ کے والد بزرگوار .... نے فرمایا کہ اگر حافظؔ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصول کی تشریح کردی جاتی تو اچھا تھا۔ علامہ نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ حافظ پرستی بھی تو بت پرستی سے کم نہیں۔ اس پر ان کے والد نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو بتوں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے مثنوی کے وہ اشعار، جن پر عقیدت مندان حافظ کو اعتراض ہے۔ آئندہ اڈیشن میں ان کا حذف کردینا ہی مناسب ہوگا۔ علامہ نے اس پر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بس مسکرا کر رہ گئے اور اپنے والد محترم سے بحث کرنے کی بجائے ان کے حضور سر تسلیم خم کردیا۔ بعد کی اشاعتوں میں علامہ نے .... ۳۵، اشعار مثنوی سے خارج کردئے"۔ سیّد فقیر وحید الدین۔ روزگار فقیر۔ جلد دوم۔ ص ۱۶۴

اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں سے حافظ کا نام نکال لیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے جب اس سلسلے میں اقبال سے دریافت کیا توانہوں نے جواباً فرمایا:۔

"خیالات میرے وہی ہیں، میں نے مصلحتاً حافظ کا نام نکال دیا ہے، کیونکہ اس میں خدشہ یہ ہے کہ اس مخالفت کی وجہ سے لوگ کہیں میرے نظرئے ہی کے مخالف نہ ہو جائیں۔ اگر وہ حافظ کو ایسا نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں، لیکن ادبیات کے متعلق میرے اس نظرئے پر غور کریں"[1]

"اسرار خودی" کے دوسرے ایڈیشن سے حافظ والے اشعار نکال کر اس کی جگہ ایک نیا عنوان "در حقیقتِ شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" قائم کیا گیا اور اپنے نصب العین کی وضاحت کیلئے ان میں سے بعض اشعار کو اس عنوان کے تحت باقی رہنے دیا گیا۔ اقبال اس عنوان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا"[2]

اقبال صلح پسند طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے رفعِ شر کیلئے "اسرار خودی" میں سے حافظ والے اشعار خارج کر دئے۔ لیکن اصل میں ان اشعار سے اقبال کا مقصود نہ حافظ کی ذات پر کوئی چوٹ تھا اور نہ ہی سچے یا اسلامی تصوف پر کوئی ضرب لگانا مراد تھا۔ البتہ انہوں نے کلامِ حافظ کی تعلیم اور اس کے اثر پر تنقید کی ہے۔ اقبال جب کہتے ہیں ۔

دعویٰ او نیست غیر از قال و قیل

دستِ او کوتاہ و خرما بر نخیل

تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حافظ فقط قال و قیل اور باتیں بنانے کے آدمی ہیں

۱۔ پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۰۹

۲۔ شیخ عطاءاللہ (مرتب) اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص۔ ۵۶

اور سعی و عمل سے جی چراتے ہیں۔ خواجہ حافظؔ خود کہتے ہیں۔

من نمے یا بم مجال اے دوستان
گرچہ او دارد جمالے بس جمیل
پائے مالنگ است و منزل بس دراز
دست ما کوتاہ و خرما بر نخیل

اقبالؔ حافظؔ کو امامِ اُمتِ بے چارگاں اس لئے کہتے ہیں کہ وہ عزم وہمت کی بجائے بے چارگی اور بے حوصلگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حافظ خود کو فقیہہ ملتِ مے خوارگاں بھی بتاتے ہیں۔ اقبالؔ نے حافظؔ کی فنی عظمت کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا ہے اور وہ ان کے رنگِ تغزل سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے ہیں۔ "پیام مشرق" اور "زبورِ عجم" کی غزلیات میں حافظ شیرازی سے اقبالؔ کے اکتساب فیض کی مثالیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ حافظؔ کے متعلق اقبالؔ کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:-

"ترشے ہوئے ہیروں جیسے آب دار لفظوں میں حافظؔ نے بلبل کی غیر شعوری روحانیت کی مٹھاس بھر دی ہے"[1]

پہلی اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ فیضی سے لندن میں ملاقات کے دوران حافظؔ کی نسبت اقبالؔ نے کہا تھا:-

"جب حافظؔ کے رنگ میں ہوتا ہوں، اس وقت ان کی سپرٹ مجھ میں آجاتی ہے اور میں خود تھوڑی دیر کیلئے حافظؔ بن جاتا ہوں"[2]

اقبالؔ حافظؔ کو بحیثیت ایک فن کار بلند مقام تفویض کرتے ہیں لیکن اس کے پہلو بہ پہلو انہیں حافظ کے کلام سے اختلاف بھی ہے۔ ان کے نزدیک

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ شذرات فکر اقبال۔ ص۔ ۱۶۷

۲۔ ضیاء الدین برنی۔ اقبال از عطیہ بیگم۔ ص۔ ۹۸

ایک ایسا فنکار، جس کے کلام کے مطالعے سے عوام کے اخلاق پر برے اثرات مرتب ہوں، پسندیدہ نہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے، خواہ اس کے نتائج مفید ہوں، خواہ مضر، تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں"[۱]

شعر کی حقیقت اور ادبیاتِ اسلامیہ کی اِصلاح

اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں حافظؔ کی جگہ قایم کیے گئے عنوان "در حقیقت شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" کے تحت اقبال نے شاعر کو نئی روح، نئے ولولوں اور نئی امنگوں کی پرورش کی دعوت دی اور اس کے سامنے نئے مقاصد اور نصب العین رکھے۔ اس عنوان کے تحت آنے والے اشعار کی ابتداء ہی میں انسان کی زندگی میں آرزو اور اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ داغ آرزو ہی ہے جو انسان کر گرم رو رکھتا ہے اس آرزو کا چراغ خاک کو آتش میں بدل دیتا ہے۔ آرزو کی بدولت زندگی گرم خیز و تیز گام ہے۔

زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را، از عشق پیغام آرزو

زندگی آرزوؤں کا دام بچھا کر اپنی تکمیل کی خواہاں ہے اور سینے میں مچلنے والی تمنائیں زندگی میں زیر و بم پیدا کرنے کا بہانہ ہیں۔ اور ہر وہ شئے جو حسن و زیبائی کا مرقع ہے، ہماری آرزوؤں کی محرک ہے۔

حسن خلاقِ بہار آرزو ست
جلوہ اش پروردگارِ آرزو ست

اقبالؔ شاعر کے سینے کو تجلّی زار حسن قرار دیتے ہیں جس سے انوار حسن پیدا

۱۔ شیخ عطاءاللہ (مرتب) اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۵۲

ہوتے ہیں۔ نگاہِ شاعر خوب کو خوب تر بنانے کا ملکہ رکھتی ہے۔ نغمہ سرائی کا فن بلبل شاعر ہی کی نوا سے سیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ پروانوں میں بھی اسی کا سوز بھرا ہوا ہے۔ شاعر کے دل میں بحر و بر کی وسعتیں مضمر ہیں اور اس کے آب و گل میں سینکڑوں جہانِ تازہ پنہاں ہیں۔ اس کی فکر ماہ و انجم کی ہم نشین ہے۔ اس کی بانگ درا سے کاروان آمادۂ سفر ہوتے ہیں۔

چوں نشیمن در ریاض ماوزد
نرمکے اندر لالہ و گل می خزد
از فریب او خود افزا زندگی
خود حساب و ناشکیبا زندگی
اھلِ عالم را صلا بر خواں کند
آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

ان اشعار میں شاعر کا بلند مقام واضح کر دینے کے بعد اقبالؔ اس قوم پر حیف کرتے ہیں جو موت سے بہرہ ور ہو اور جس کا شاعر ذوقِ حیات سے عاری ہو۔ اور جس کی غلط اقدار زشت کو خوب بنا دیتی ہیں۔ اقبالؔ ایسے شاعر کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں جو بلبل کے دل سے لذّتِ پرواز لوٹ لے۔ انسان کے اعصاب کو اپنی شاعری کے افیون سے سُست کر ڈالے۔ جس شاعر کے افکار و خیالات انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیں، جس کے نغمے اس کے دل سے ثبات لوٹ لیں، جس کے طلسم سے انسان موت کو حیات سمجھے، جو انسان کے دل سے ہستی کی آرزو نکال دے۔ جو ہر سود کو زیاں کی شکل میں پیش کرے ہر محمود کو مذموم بنائے۔ جو انسان کو فکر و اندیشے کے دریائے قعر میں گرا دے اور اسے عمل سے بیگانہ کر دے جس کے کلام کا مطالعہ کر کے خستہ حال انسان اور بھی خستہ حالی سے ہمکنار ہو جائے، جس

کے دورِ جام سے یہ بزمِ عالم اور خستہ حال ہو جائے، جس کے نیستاں میں انسان کبھی بجلی کا مشاہدہ نہ کرے، جس کا گلشن حقیقت میں رنگ و بو کا ایک سراب ہو، جس کے حسن میں صداقت کا نام و نشان تک نہ ہو، جو خواب کو بیداری سے خوشتر سمجھے، جس کے نغموں سے انسان کے دل میں جوش اور ولولہ نہ رہے۔ زیر بحث عنوان کے چوتھے اور آخری بند میں اقبال شاعر کو زندگی کا روح پرور پیغام دیکر کہتے ہیں کہ دنیا میں عمل کی رہنما فکرِ روشن بین ہے۔ شاعر سے شعر و ادب میں فکرِ صالح پیدا کرنے اور اس کیلئے سُوئے عرب مراجعت کرنے یعنی ادبیاتِ اسلامیہ میں دوبارہ اسلامی روح پھونکنے کی تلقین کی گئی ہے۔

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبحِ حجاز از شام کرد

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی مصرعہ ثانی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"دوسرے مصرعے میں شیخ حسام الدین ضیاالحق کے مقولے کی طرف اشارہ ہے۔ امیست کردیاً واصبحت عربیاً، میں شام کو کردی تھا اور صبح کو عربی بن گیا۔ مطلب یہ کہ رات ہی رات کے اندر خدا کے فضل سے وہ علوم و معارف حاصل ہو گئے کہ صبح ہوتے ہی ایک جاہل و ناداں انسان فاضِل اجل اور خازنِ اسرارِ الٰہی بن گیا"[۱]

شاعر سے کہا گیا ہے کہ تم نے عجم کے چمن زار سے خوب گل چینی کی اور نو بہار ہند و ایران بھی خوب دیکھ لی۔ اب شعر و ادب تجھ سے گرمئی صحرا اور بادۂ دیرینہ خرما کا مزہ چکھنے کا متقاضی ہے۔ شعر و ادب اب تجھ سے کھردرا کپڑا پہننے کی سختی کا خوگر بننے، ریگِ سوزاں پر چلنے اور زمزم کے چشمے میں غوطہ زن

۱۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی۔ مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال۔ ص۔ ۳۸۳

ہونے کا تقاضہ کر رہا ہے۔ اقبالؔ شاعر سے اپنے دل و دماغ کو بلند و بالا نصب العین کا مرکز بنانے کی ہدایت کرتے ہیں، جہاں سے ایسے افکار و خیالات قارئین تک پہنچیں جو ان کے اخلاق و کردار میں رفعت پیدا کریں۔ شاعر کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا پاسبان ہونا چاہئے۔ اسے عظیم الشان اسلامی روایات کا امین ہونے کا بخوبی احساس ہو۔ اس لئے اسے کارزارِ حیات سے برسرِ پیکار ہو کر اپنی بلندیٔ افکار و کردار کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

اے ھما از یُمنِ دامت ارجمند
آشیانی ساز بر کوہِ بلند
آشیانی برق و تُندر در بری
از کنامِ جرّہ بازاں برتری
تاشوی در خورو پیکارِ حیات
جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

خودی کی تربیت کے تین مرحلے۔ مرحلۂ اوّل اطاعت، مرحلۂ دوم ضبطِ نفس، مرحلۂ سوم نیابت الٰہی۔

اب تک اقبالؔ نے خودی کو مستحکم کرنے اور اس میں ضعف پیدا کرنے والی مثبت اور منفی قوتوں کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر خودی کو تخلیق مقاصد اور عشق سے استحکام حاصل ہوتا ہے اور سوال اور فلسفۂ افلاطون اور انحطاط پذیر ادبیات خودی کی بابت موت کا حکم رکھتے ہیں۔ خودی کی ان مثبت اور منفی قوتوں کا جائزہ لینے کے بعد خودی کی تربیت اور اس کی نشو و نما کیلئے اقبالؔ نے ایک دستور العمل پیش کیا ہے جو مراحل سہ گانہ پر مشتمل ہے۔ پہلا مرحلہ اطاعت،

دوسرا مرحلہ ضبط نفس اور تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی۔ پہلے مرحلے یعنی اطاعت کا جائزہ لینے اور اس کو سمجھانے کے لئے اقبالؔ نے اونٹ کی مثال دیکر اسے اطاعت کے مظہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ اونٹ طبعاً خدمت گذار اور محنت شعار جانور ہوتا ہے اور بڑے ہی صبر و استقلال کے ساتھ صحراؤں کی تپتی ہوئی ریت پر محو سفر رہتا ہے۔ اونٹ کی خصوصیات کا ذکر کر کے اقبالؔ نے انسان میں بھی اپنے فرائض کا بوجھ اٹھانے کیلئے اونٹ کا سا جذبہ اور کیفیت پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

تو ہم از بار فرائض سر متاب
بر خودی از عندہ حسن المآب

یہاں پر آئین کی پابندی کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ اطاعت الٰہی کرنے میں انسان کو اپنی غفلت کے باعث اپنی جان پر ایک جبر سا محسوس ہوتا ہے اور اس راستے میں انسان کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اطاعت الٰہی کرنے میں انسان کا اختیار مضمر ہے کیونکہ یہ اطاعت یا فرمان پذیری ہی ہے جو ناکس کو کس بنا دیتی ہے۔ سرکشی یا عدمِ اطاعت سے بھڑکتے اور لپکتے شعلے خس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آئین الٰہی کی پابندی کرنے سے انسان مہ و پروین پر کمندیں ڈال کر انہیں مسخر کر سکتا ہے۔ اطاعت کے نتیجے میں انسان یا اشیائے کائنات کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں اقبالؔ فطرت کے مظاہر سے اپنے نظرئے کا جواز پیش کرتے ہیں کہ ہوا اس وقت خوشبو بن جاتی ہے جب وہ پھول کے زندان میں قید رہتی ہے اور بُو اس وقت نافہ آہو بن جاتی ہے جب وہ پابندی کا مرحلہ طے کر لیتی ہے۔ ستارے، سبزہ و گل اور پانی کے قطرے ایک آئین فطرت کے تابع ہو کر نکھرتے، سنورتے اور منزل مقصود پر پہنچتے ہیں، تو

پھر کیا سبب ہے کہ انسان اپنی نادانی کے باعث آئین زندگی سے غافل ہو چکا ہے۔ یہاں پر مسلمان کو اپنے آئین سے ہرگز آزاد نہ رہنے کی تاکید کی گئی ہے بلکہ اس نقرئی زنجیر کو اپنے پاؤں کی زینت بنانے کی تلقین کی گئی ہے، جس نے اسے نظم وضبط کا پابند بنا کر اس میں قوت اور شان و شوکت پیدا کی تھی۔

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل
ذرّہ ہا صحر است از آئینِ وصل
باطن ہر شئے ز آئینی قوی
تو چرا غافل ز ایں سامان روی
باز ای آزاد دستورِ قدیم
زینت پا کن ھمان زنجیر سیم
شکوہ سنجِ سختیِ آئین مشو
از حدودِ مصطفیؐ بیرون مرد

موخرالذکر شعر میں مسلمان کو آئین کی دشواری کا شکوہ سنج نہ ہونے اور حدودِ مصطفیؐ یا شریعت محمدی ﷺ سے ہرگز باہر نہ رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ ؎

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس:-

خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے۔ اقبالؔ نے نفسِ انسانی کو اُشتر کی زندگی کے دوسرے پہلو خود پروری، خود پرستی اور خودسری کا ذکر کیا ہے۔ انسان مرد بن کر اس کی مہار کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ تھام لے تاکہ دنیا میں باوقار ہو جائے کیونکہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ پر فرماں روا نہیں ہوتا،

دوسروں کے حکم کا فرماں پذیر ہو جاتا ہے۔ "اونٹ کی طرح نفس کی باگ ڈور زور سے تھام کر رکھنی پڑتی ہے جہاں ذرا یہ باگ ڈھیلی پڑی، نفس کی سرکشی بڑھ گئی۔ اگر انسان اپنے پر حکمران نہ ہوگا، تو اسے دوسروں کا تابع فرماں ہونا پڑے گا"[1] چونکہ انسان کی تعمیر آب و گل سے کی گئی ہے اس لئے اس میں خوف اور محبت کے جذبات داخل کئے گئے ہیں۔ یہ خوف خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جان اور پھر ارض و سما کے آلام کے خوف کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور جہاں تک اس کی سرشت میں محبّت کے جذبے کی کارفرمائی کا تعلق ہے یہ محبّت مال و دولت کی محبّت، وطن کی محبّت، اپنی ذات کے تئیں محبّت، اقربا سے محبّت اور حب الوطنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، مگر ضبطِ نفس کی بدولت انسان کے اندر جرأت اور آزادی پیدا ہو جاتی ہے اور ضبط نفس اسے ہر طرح کے خوف سے رہائی عطا کرتا ہے۔ عصائے لاالٰہ خوف کے طلسم کدے کو پاش پاش کر دیتا ہے، جس شخص کے تن میں زورِ حق کی بدولت جاں پڑ گئی ہو، اس کی گردن باطل کے سامنے ہرگز جھک نہیں سکتی۔ اس کے سینے میں خوف کو راہ نہیں ملتی۔ اور وہ غیر اللہ کے خوف سے ہرگز خائف نہیں ہو سکتا۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شد

انسان کا ان مخمصوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے اسلام کے ارکان خمسہ یعنی توحید، نماز، روزہ، زکواۃ، اور حج کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ کلمۂ توحید کا راز لا الہ الا اللہ میں مضمر ہے۔ انسان اپنے آپ کو خالقِ کائنات کے زیر اطاعت کرے اور اس کی رضا کے آگے اس طرح سر تسلیم خم کرے جس طرح حضرت

ا۔ نثار احمد قریشی۔ علامہ اقبال صوفی تبسم کی نظر میں۔ ص۔ ۱۶۶

ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اسی کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا تھا۔

می کند از ماسویٰ قطع نظر
می نہد سا طور بر حلقِ پسر

ماسواء سے قطع نظر کرنے والا اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ تنہا ہجوم فوج و لشکر پر گراں ہوتا ہے۔ کلمہ کے بعد اسلام کے بقیہ چار ارکان یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ لا الٰہ اِلّا اللہ ایک صدف ہے اور نماز اس کا گوہر۔ دلِ مسلم کے حق میں نماز حج اصغر کا حکم رکھتی ہے۔ نماز مسلمان کے حق میں شمشیر خون آشام ہے جس کا کام قتل فحشار اور نہی عن المنکر ہے۔ روزہ بھوک اور پیاس جیسے امراض کیلئے درماں کا کام کر کے انسان کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح حج مومن کی فطرت کو جلا بخشتا ہے۔ زکواۃ حُبِّ دولت کو فنا کر دیتی ہے اور یہ مسلمان کو مساوات سے آشنا کر دیتی ہے۔ صوفی تبسّم کے الفاظ میں:۔ "زکواۃ انسانی مساوات کو قایم رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ زکواۃ انسانی طبائع کو اعتدال پر لاتی ہے۔ حبّ دولت کو مٹاتی ہے اور ایثار کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور نظام حیات میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ قرآن کے فرمان کے مطابق زکواۃ نیکی کے معراج کی نشاندہی ہے"[1] یہ تمام اسباب مسلمان کو استحکام عطا کرنے کیلئے ہیں۔ اگر مسلمان کا اسلام محکم ہے تو وہ بھی پختہ ہے۔ ضبطِ نفس کیلئے اقبال "یا قوی" کے وِرد کو لازم قرار دیتے ہیں۔

۱۔ نثار احمد فاروقی (مرتب) علامہ اقبال صوفی تبسّم کی نظر میں۔ ص۔ ۱۶۸

اہلِ قوت شو زوردِ یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی

ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے الفاظ میں "شعائر اسلام کی پابندی ضبط نفس کا باعث بنتی ہے۔ ان سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ اور اس میں قوت پیدا ہوتی ہے۔"[۱]

مرحلۂ سوم نیابت الٰہی:۔

نیابت الٰہی تربیت خودی کا مرحلہ سوم ہے۔ تربیت خودی کا یہ مرحلہ انسان کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔ خودی کی تربیت کے پہلے دو مرحلے یعنی اطاعت اور ضبط نفس کو طے کرنے کے بعد جب انسان اس مرحلے پر پہنچتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں نائبِ حق یا نائب الٰہی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے انسان اس کرۂ ارض پر خدا کا نائب یا خلیفہ ہے "انی جاعل فی الارض خلیفہ" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکر اقبال" میں اسرار خودی پر بحث کرتے ہوئے تربیت خودی کے تیسرے مرحلے نیابت الٰہی کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اقبال کے ہاں خودی کا تصور در حقیقت قرآن کریم کے نیابت الٰہی کے تصور کا آئینہ ہے۔ خدا کی ذات لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ خدا کی مشیت اور قوتوں کے سامنے خاک و افلاک ذرہ خورشید سب سربسجود ہیں۔ قرآن کریم میں جس نصب العینی آدم کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ بھی مسجود ملائک ہے۔ جس طرح خدا خود مسجود ملائک ہے۔ اس ظاہری تضاد سے توحید میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ جب کسی بادشاہ کا وزیر یا نائب پوری طرح سے اس کی سیاست کو سمجھنے والا اور تہہ دل سے اس کے احکام کا بجالانے والا ہو تو اگرچہ سرچشمہ اقتدار بادشاہ

۱۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۳۴

ہوتا ہے لیکن رعایا کو نائب کی اطاعت اسی طرح کرنی پڑتی ہے جس طرح بادشاہ کی"[۱]

جب انسان اپنے اشترِ خاکی پر سوار ہو جاتا ہے یعنی جب وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالیتا ہے تو اس کا سر تاجِ سلیمانی سے تاجدار ہوتا ہے۔ اسے عزّت و توقیر حاصل ہوتی ہے۔ اسے اعلیٰ رتبے سے نوازا جاتا ہے۔ وہ رہتی دنیا تک جہاں آرا رہتا ہے اور ملک لایبلی کا تاجدار ہو کر زمانے کی دستبرد اور حوادث سے محفوظ رہتا ہے۔ اس دنیا میں نائب حق بن کر رہنا خوب ہے اور عناصر پر حکمران رہنا بہت خوب ہے۔ نائب حق اس عالم کی جان ہوتا ہے اور اس کی زندگی اسمِ اعظم کا ظل ہوتی ہے۔ اس کی اور بھی خصوصیات بتائی گئی ہیں جو اس طرح ہیں ؂

از رموز جزو کل آگہ بود
در جہاں قائم با مر اللہ بود
خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند
ایں بساطِ کہنہ را برھم زند
فطر تش معمور و می خواہد نمود
عالمی دیگر بیار د در وجود
صد جہاں مثل جہان جزو کل
روید از کشتِ خیال او چو گل
پختہ سازد فطرت ہر خام را
از حرم بیرون کند اصنام را

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ فکر اقبال۔ (ایڈیشن ۱۹۷۷ء) ص۔ ۳۹۴

نغمہ زا تارِ دِل از مضرابِ اُو
بہرِ حق بیداری او خوابِ او
شیب را آموزد آھنگِ شباب
می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

اقبال نے تربیت خودی کے تیسرے مرحلے نیابت الٰہی کے ذکر کے سلسلے میں انسان کو اس قدر رفیع اور جلیل رتبہ عطا کیا ہے کہ ناقدین کے خیال میں اقبال نے نیابت الٰہی کے پردے میں انسان کو خدا بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے جوش میں آ کر وہ اشعار کہے جن میں انسانیت اور الوہیت کے ڈانڈے ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

از قُم او خیزد اندر گورِ تن
مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن
ذات او توجیہہ ذات عالم است
از جلالِ اور نجاتِ عالم است
جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے اُو
صد کلیم آوارۂ سینائے او

اس نوع کے اشعار پر اقبال کے ایسے ناقدین کو اعتراض کرنے کا جواز کہاں تک بنتا ہے اس کا فیصلہ قارئین کرام خود بخود اس وقت کر سکتے ہیں جب وہ قرآن کریم میں درج ان اشارات پر غور کریں جن کے مطابق انسان عبودیت میں کامل ہو کر اور خدا کی ذات کو اپنی ذات کے اندر سمو کر جو بھی فعل کرتا ہے، بقول خلیفہ عبدالحکیم ”اس کے فعل میں اور خدا کے فعل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس کی

نمایاں مثال قرآن کی اس آیت ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ[1] سے پیش کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن میں اس قسم کی اور بھی آیات درج ہیں۔ پھر اسلامی تعلیم کی رو سے انسان اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے اور ان میں اس حد تک اضافہ کرتا چلا جائے کہ وہ خدا کے قریب تر ہو جائے۔ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں:۔

"یہ نائب حق کسی بنے بنائے عالم کے ساتھ موافقت کی کوشش ہی میں نہیں لگا رہتا۔ وہ شکوہِ فلک میں آہ وزاری نہیں کرتا رہتا بلکہ زمین و آسمان کو متزلزل کرکے فلک راسقف بشگافیم وطرح دیگرانداز یم کیلئے بھی آمادہ ہوتا ہے"[2]

نائب حق نوع انسان کے حق میں بشیر اور نذیر ہوتا ہے۔ اس کی ذات مدعائے علم الاسماء اور سرِّ سبحان الذی اسریٰ ہے۔ اس کی ہیبت دریائے نیل کو خشک کر دیتی ہے۔ اس کی "قم" سے مُردے میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کے سائے میں ذرّہ آفتاب بن جاتا ہے۔ اور زندگی کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کی نئی تفسیریں بیان کرتا ہے۔ اس کی ہستی رازِ حیات ہے اور سازِ زندگی کی ایک عجیب آواز ہے۔ نیابت الٰہی عنوان کے آخری اشعار میں شاعر سوارِ اشہبِ دوراں کا بڑی بے صبری کے ساتھ منتظر ہے اور اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہے تاکہ رونقِ ہنگامۂ نو ایجاد ہو۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے الفاظ میں

۱۔ اقبال کے مرشد روحانی مولانا رومیؔ کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

(ا) توز قران باز خوان تفسیر بیت — گفت ایزد مارمیت اذ رمیت
گر بپرانیم تیر آن نے زماست — ماکمان و تیرا ندازش خداست

(ب) مارمیت اذ رمیت احمد بدہ است — دیدن او دیدنِ خالق شدہ است
مدحت او مدحت و تسبیح حق — میوہ مے رویدز عینِ ایں طبق
دو مگوی، دو مدان ودو مخوان — بندہ را در خواجہ خود محو دان

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ فکر اقبال۔ ص۔ ۲۹۵

"ہماری مشتِ خاک ہی سے اس شہسوار کا ظہور ہونے والا ہے۔ شاعر اس بات کا شدید خواہاں ہے کہ یہ سوار اشہبِ دوراں آکر اس شورشِ اقوام کا خاتمہ کر کے اپنے نغموں کو فردوس گوش بنادے تاکہ دنیا میں پھر سے قانونِ اخوت عام ہو۔ دنیا میں پھر سے صلح کے ایام عود کر آئیں اور شیدایانِ جنگ کو پیغامِ صلح دے دے۔ اقبالؔ نوع انسان کو مزرع اور آنے والے اس شہسوار کو اس مزرع کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے کاروانِ حیات کے واسطے منزل سمجھتے ہیں۔ خزاں نے ظلم و ستم کر کے گلستان میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اقبالؔ اس مثالی انسان سے بہار کی مانند آنے کی دعوت دے رہے ہیں اور اسے گزارش کرتے ہیں کہ ہمارے بچّوں اور بوڑھوں کی شرمسار جبینوں سے سجدے بطور نذر لے لے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
ای فروغ دیدۂ امکان بیا
رونقِ ہنگامہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ھا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمہ ی خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دِہ
جام صہبا ی محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجو یان را بدہ پیغام صلح
نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

ریخت از جورِ خزاں برگ شجر
چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر
سجدہ ہای طفلک و برناو پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر
از وجودِ تو سرافرازیم ما
پس بسوز ایں جہاں سازیم ما

شرح اسرار اسمائے حضرت علی مرتضیٰؓ

تربیت خودی کے مراحل سہ گانہ بیان کرنے کے بعد "در شرح اسرار اسمائے علی مرتضیٰؓ" کے عنوان کے تحت حضرت علیؓ کے اسماء گرامی کے اسرار کی شرح کی گئی ہے۔ اس عنوان کے تحت آنے والے ابتدائی اشعار میں علامہ نے پہلے حضرت علیؓ کے تئیں اپنی بے پناہ عقیدت اور محبّت کا اظہار کر کے انہیں مسلم اوّل اور شہ مرداں جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ بُوتراب حضرت علیؓ کی کنّیت تھی۔ اور یہ نام انہیں مرسل حقؐ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے بدن کو، جس کی تعمیر خاک سے ہوئی ہے، مکمل طور سے مسخر کرلیا تھا۔

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بُو تراب از فتح اقلیم تن است
مرد کشور گیر از کرّاری است
گوہرش را آبرو خودداری است
ہر کہ در آفاق گردد بو تراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

تیسرا شعر مرزا غالبؔ کی ایک مشہور فارسی غزل ؎

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں، بگرادنیم

کے اس شعر جو یقین محکم کا آئینہ دار ہے، کی یاد تازہ کرتا ہے

زحیدریم ؒ من و تو، زما عجب بنود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

غالبؔ کی یہ فارسی غزل اقبال نے اپنے فارسی مجموعہ کلام ''جاوید نامہ'' میں نقل کی ہے۔ بہر حال اقبالؔ کے نزدیک بدن پر تسخیر پانے والا شکوہِ خیبر کو اپنے پاؤں تلے کر دیتا ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کو دروازہ شہر علوم کہا گیا ہے۔ حدیث نبویؐ کے مطابق حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم علم کا شہر ہیں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ (انا مدینتہ العلم و علی بابھا) اور چین و حجاز اور شام و روم، جو علوم کے گہوارے مانے جاتے ہیں، حضرت علیؓ کے تابع فرمان ہیں، اقبالؔ مسلمان سے اپنی خاک کو تابع فرمان بنانے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ

خاک گشتن مذہبِ پروانگیست
خاک را رب شو کہ ایں مردانگیست

اقبال انسان کو پتھر کی مانند سخت ہونے کی تاکید کرتے ہیں تا کہ اس سے دیوار چمن کی بنیاد قائم کی جائے۔ انسان اپنے اندر ایسی قوت پیدا کرے کہ اس کی خاک سے انسان پیدا ہوں اور انسان کے لئے نئے جہاں تعمیر کئے جائیں۔ اگر انسان اپنے لئے دیوار و در نہ بنائے۔ تو اس کی مٹی سے دوسروں کے گھر بنائے جائیں گے۔ انسان اپنی بے عملی کے باعث جورِ فلک کا رونا روتا رہتا ہے لیکن اس سے

کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ کیونکہ سعیٔ پیہم ہی میں مضمونِ حیات مضمر ہے اور لذّتِ تخلیق قانونِ حیات ہے۔ اس لئے انسان سے نئے جہانوں کی تخلیق کرنے اور شعلے میں لپٹ کر خلیل بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ جہاں انسان کے حق میں نامساعد ہے تو اس سے نبرد آزما ہو کر ایک ایسے جہاں کو بنایا جائے جو اس کے حق میں موافق اور سازگار ہو۔ انسان کو شخصیت میں چھپی ہوئی صلاحیتوں یا امکانات کا اظہار مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ زندگی نام ہے قوّت و شوکت کا۔ اور اس کی اصل ذوق تسخیر میں پنہاں ہے۔ کاہل شخص ناتوانی کو قناعت کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ ناتوانی زندگی کے حق میں رہزن کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بطن سے خوف اور دروغ پیدا ہوتے ہیں۔ ناتوانی مختلف روپ دھار کر انسان کے حصول مقصد کے راستے میں حائل رہتی ہے۔ یہ کبھی رحم کبھی نرمی، کبھی جبر و انکسار اور کبھی تن آسانی کی صورت اختیار کر کے صاحبِ قوّت کے دل پر ڈاکہ ڈالتی ہے۔ اس کے بر خلاف توانائی یا قوّت اور کمال کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ زندگی کھیتی ہے اور قوّت یا توانائی اس کا حاصل ہے۔ قوّت اپنے دعوے کیلئے کسی حُجّت و تکرار کی محتاج نہیں۔ قوّت و توانائی اور ناتوانی کے متعلق اقبال کہتے ہیں ؎

زندگانی قوت پیداستے
اصل او از ذوق استیلاستی
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

با توانائی صداقت توأم است
گر خود آگاہی همین جام جم است
از رموز زندگی آگاه شو
ظالم وجاہل ز غیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشادی ہوشمند
گر نبینی راہ حق بر من بخند

فلسفۂ خودی اور فلسفہ انسان کامل کی توضیحات کے بعد اسرار خودی میں چند حکایتیں بیان کی گئی ہیں جن کے توسط سے اقبال نے اپنے افکار کی ترسیل اور ابلاغ تمثیلی پیرائے میں کی ہے۔ بقول انہیں کے۔

شرحِ راز از داستانہا می کنم
غنچہ از زورِ نفس وامی کنم

اسرار خودی میں اقبال نے فارسی شاعری کی قدیم روایت کی پیروی کرتے ہوئے اپنے افکار و خیالات تمثیلی پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ تمثیلی پیرایہ اختیار کر کے فن کار اپنے دقیق خیالات قارئین کے ذہنوں میں بہ آسانی منتقل کر سکتا ہے۔ فارسی شاعری کی اس قدیم روایت کا آغاز حکیم سنائی نے بہت پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد فارسی کے دیگر اساتذہ شعر مثلاً نظامی، عطار، رُومی، امیر خسرو اور مولانا جامی وغیرہ نے بھی اس روش کو اختیار کر کے اپنے کلام میں جگہ دی۔ اقبال کی شاعری کا بالاستعیاب مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ انہوں نے فارسی کے کئی اساتذہ شعراء کے گہرے اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر قبول کیے ہیں۔ چنانچہ فارسی شاعری کی قدیم روایت کے سلسلے میں حکایات کی روایت کو اپنانا اس بات کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ بہر حال اسرار خودی میں جو

حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ اس طرح ہیں۔ (۱) حکایت نوجوانے از مرو کہ پیش حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ آمدہ از ستم اعدا فریاد کرد۔ (۲) حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود (۳) حکایت الماس و زغال (۴) حکایت شیخ و برھمن و مکالمہ گنگا و ھمالہ در معنی اینکہ تسلسلِ حیات ملّیہ از محکم گرفتن روایاتِ مخصوصہ ملّیہ می باشد۔

کشت انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را بر انگیزد ز خواب

جہاں تک پہلی حکایت کا تعلق ہے۔ اسے ایک تاریخی واقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان مروزی کی حکایت ہے جو وسط ایشیاء کے شہر مرو سے چل کر لاہور حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ اعدا کے بے پناہ ظلم و ستم نے اس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اقبال نے حکایت کی ابتداء میں حضرت ہجویریؒ کا تعارف ذیل کے اشعار میں اس طرح کرایا ہے۔

سیّد ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیر سنجر را حرم
بند ہائے کوہسار آساں گسیخت
در زمینِ ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروقؓ از جمالش تازہ شد
حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد
پاسبانِ عزّت ام الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب

صبح ما از مہراو تابندہ گشت
خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
عاشق و ہم قاصدِ طیارِ عشق
از جبینش آشکار اسرار عشق

نوجوان نے حضرت ہجویریؒ سے شکایت کی کہ دشمن اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کی ایذارسانی کے درپے ہیں۔ اس لئے مجھے دشمنوں کے بیچ زندہ رہنے کی کوئی ترکیب بتائیں۔ اسی پر حضرت ہجویریؒ نے نوجوان کو رازِ حیات سے آگاہ کرتے ہوئے اغیار کے اندیشے سے بے فکر ہونے اور اپنی قوتِ خوابیدہ کو بیدار کرنے کی تلقین کی، راہرو جس وقت اپنے ناتوان ہونے کا اظہار کرتا ہے تو یوں سمجھنا چاہئے کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو رہزن کے سپرد کیا۔ کیونکہ ۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

حضرت ہجویریؒ نے نوجوان سے کہا کہ تو اپنے دوستوں سے سرگراں اور دشمنوں کا شکوہ سنج کس لئے ہے۔ آخر دشمن بھی تمہارا دوست ہی ہے جس کی ہستی کی بدولت تیرے بازار کی رونق قائم ہے۔ اس دنیا میں دانائے مقامات خودی اپنے دشمن کو، اگر وہ قوی ہو، خدا کا فضل سمجھتے ہیں کیونکہ کشت انسان کے حق میں دشمن سحاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بدولت انسان کے امکانات میں انقلاب برپا ہوتا ہے ۔

سنگ رہ آب است اگر ہمت قوی است
سیل را پست و بلند جادہ چیست

سنگ رہ گردد فسانِ تیغ عزم
قطعِ منزل امتحانِ تیغ عزم

اس کے بعد آنے والے اشعار میں انسان کو ایک مرتبہ پھر اپنی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا گیا ہے کیونکہ اپنی خودی میں استحکام پیدا کرنے کے بعد انسان میں اختیار پیدا ہو جاتا ہے وہ اگر چاہے دنیا کو درہم برہم کر سکتا ہے، اگر انسان اپنی خودی کو محکم نہ کرے تو اس کا وجود ہیچ ہے۔ انسان کا وجود اس کی خودی کے استحکام کی بدولت ہے ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوان بھی کھاتے پیتے اور سوتے ہیں، اگر انسان اپنی بقاء کا خواہاں ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے آپ میں آباد ہو جائے اور خود سے آزادی یا خود کو نظر انداز کرنے یا خود سے بیگانگی اختیار کرنا انسان کے حق میں موت ہے۔ خود سے بیگانگی انسان کے لئے فنا ہے۔ موت کیا ہے؟ موت اپنی خودی سے بیگانہ ہونے کا نام ہے۔ انسان اپنی غفلت کے باعث فراقِ جان و تن کو موت سمجھتا ہے۔ لیکن انسان پہلے حضرت یوسفؑ کی طرح اپنی خودی میں مقام کرلے پھر اسیری سے شہنشاہی کی طرف قدم بڑھائے۔

از خودی اندیش و مردِ کارشو
مردِ حق شو حاملِ اسرار شو
شرح راز از داستانہا میکنم
غنچہ از زورِ نفس وامیکنم

حکایت کا اختتام مولانا رُوم کے اس شعر پر ہوتا ہے۔

خوشتر آن باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

پیاسے پرندے کی حکایت:۔

اسرارِ خودی میں بیان کی گئی دوسری حکایت "حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود" ہے یہ ایک ایسے پرندے کی حکایت ہے جو پیاس کی شدت سے بہت بیتاب تھا، حکایت بیان کرنے سے یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ مثنوی نگاروں نے اپنی مثنویوں میں اکثر طائروں اور جانوروں کی کہانیاں بیان کر کے ان سے دلچسپ اور اہم نتائج اخذ کئے ہیں جو انسان کی زندگی پر دیرپا اور لازوال نقوش چھوڑ دیتے ہیں۔ فارسی کے مشہور و معروف شاعر فریدالدین عطّار کی مثنوی "منطق الطیر" پرندوں کی داستان پر مشتمل ہے جس میں مولانا عطّار نے تمثیل کے پیرائے میں زندگی کے اسرار اور خدا اور انسان کے باہمی رشتے کی عارفانہ تعبیر کی ہے۔ اقبالؔ نے بھی فارسی شاعری کی اس روایت کا تتبّع کرتے ہوئے اسرارِ خودی میں ایک ننّھے سے تشنہ طائر کی داستان کے پردے میں خودی کے تحفظ کے فلسفہ کی مزید توضیح کی ہے۔ حکایت یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک پرندہ مارے پیاس کے نہایت بے تاب تھا۔ دفعتاً اس کی نظر باغ میں پڑے ہوئے الماس کے ایک پرندے پر پڑی۔ پیاس کی شدّت سے نڈھال ہو کر اسے ریزۂ الماس پر قطرۂ آب کا گماں ہوا جو سورج کی شعاعوں سے چمک رہا تھا۔ ناداں پرندے نے اسے چمکتے ہوئے ریزۂ الماس پر اپنی پیاس بجھانے کے لئے خوب ٹھونگیں لگائیں لیکن سراب سے کبھی کسی کی پیاس بجھی ہے کیا؟ اقبالؔ نے ریزۂ الماس کو قوتِ گفتار عطا کر کے گرفتارِ ہوس طائر کو حیاتِ خود نما کے راز سے آگاہی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

گفت الماس اے گرفتارِ ہوس
تیز بر من کردہ منقارِ ہوس
قطرۂ آبے نیم ساقی نیم

من برائے دیگراں باقی نیم
قصدِ آزارم کنی دیوانۂ
از حیاتِ خود نما بیگانۂ
آبِ من منقارِ مرغاں بشکند
آدمی را گوہر جان بشکند

لاکھ کوشش کرنے کے باوجود جب ریزۂ الماس پیاسے طائر کی پیاس نہ بجھا سکا، تو طائر بیچارا مایوس ہو کر وہاں سے چل دیا۔ اس کی تمنا دل میں حسرت بن کر رہ گئی۔ اس کے لبوں پر نغمہ فریاد کی صورت میں آنے لگا۔ اتنے میں اسے پھول پر شبنم کا قطرہ اشک بلبل کی مانند جلوہ گر نظر آیا۔ اس کی چمک سپاسِ آفتاب میں محو تھی اور آفتاب سے خائف ہو کر اس کا بدن لرزہ براندام تھا۔

کوکبِ رم خوئے گردوں زادۂ
یکدم از ذوقِ نمود استادۂ
صد فریب از غنچہ و گل خوردۂ
بہرۂ از زندگی نابردۂ
مثلِ اشکِ عاشق دلدادۂ
زیب مژگانے چکیدہ آمادۂ

پیاس کی شدت سے بیتاب پرندہ جب اس شاخ کے نیچے گیا تو شبنم کا قطرہ ٹپک کر اس کے منہ میں آ گرا۔ اس طرح اس نے دوسرے کی زندگی کو اپنا سرمایہ بنایا۔ آخری اشعار میں حفظ خودی کا پیغام دیکر انسان کو ایک لحظہ کیلئے بھی خودی سے غافل نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان کو شبنم کے قطرے کی طرح نرم و نازک نہیں ہونا چاہئے بلکہ ریزۂ الماس کی طرح سخت ہونا چاہئے اور اس جہاں

میں پختہ فطرت ہونے کیلئے کہسار کی مثال کو ملحوظ نظر رکھنا چاہئے۔

اے کہ می خواہی ز دشمن جان بری
از تو پرسم قطرۂ یا گوہری؟
چوں ز سوز تشنگی طائر گداخت
از حیات دیگرے سرمایہ ساخت
قطرہ سخت اندام و گوہر خو بنود
ریزۂ الماس بودو او بنود
غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو، شبنم مشو
پختہ فطرت صورت کہسار باش
حامل صد ابر دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجابِ خویش
سیم شو از بستن سیماب خویش
نغمہ پیدا کن از تارِ خودی
آشکارا ساز اسرارِ خودی

"حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود" عنوان کے تحت اقبالؒ نے ریزۂ الماس اور شبنم پر جو اشعار لکھے ہیں وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں: "براہِ راست نطشے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ ایک پرندہ ریزۂ الماس کو شبنم سمجھ کر چاٹنے لگا لیکن اس کی سختی کیوجہ سے شکست کھا گیا۔ اس قسم کا مضمون اقبالؒ نے ابوالعلیٰ معریٰ والی نظم میں بھی بیان کیا ہے۔ معریٰ مذہبًا" آزاد خیال شخص تھا۔ گوشت نہیں کھاتا تھا۔ کسی نے بُھنا ہوا تیتر اس کو بھیجا کہ شائد اس کے منہ میں پانی بھر آئے لیکن وہ

تیتر کو مخاطب کر کے پوچھنے لگا کہ کیوں بھائی کس قصور میں یہ سزا ملی۔ خود ہی جواب دیتا ہے کہ یہ کمزور ہونے کی سزا ہے۔ اگر شاہین ہوتا تو خود شکار ہونے کے بجائے دوسروں کو شکار کرتا۔ زندگی میں کمزور ہونا ہی سب سے بڑا جرم ہے"[1]

ہیرے اور کوئلے کی حکایت:

تیسری حکایت "حکایت الماس و زغال ہے" یہ حکایت ہیرے اور کوئلے کی حکایت ہے اس حکایت کے ذریعے اقبال ایک مرتبہ پھر حقیقت سے نقاب کشائی کر کے ایک داستان سنا رہے ہیں۔ زغال نے کان میں ہیرے سے کہا کہ اس جہاں میں ہم دونوں کے وجود کی اصل ایک ہے۔ ہم دونوں ہم دم ہیں اور ہماری ہست و بود یکساں ہے۔ اگرچہ ان چیزوں کے اعتبار سے ہم دونوں مساوی ہیں تو پھر کیا سبب ہے کہ میں کان میں دردِ ناکسی میں مردہ پڑا ہوں۔ اور تیری رسائی سر تاجِ شہنشاہاں تک ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے میں ایسا ہوں کہ خاک مجھ سے بہتر ہے لیکن تیری خوب صورتی آئینے کے دل کو بھی چاک کر دیتی ہے اور۔

روشن از تاریکیٔ من مجمر است
پس کمالِ جوہرم خاکستر است
پُشتِ پا ہر کس مرا بر سر زند
بر متاعِ ہستیم اخگر زند

اس لئے میں اپنی ہستی پر گریہ کیوں نہ کروں۔ میری ہستی دھوئیں کی ایک موج کے مثل ہے جس سے کبھی کوئی چنگاری پھوٹ پڑتی ہے لیکن تیری صورت اور سیرت ایک تابناک ستارے کی مانند ہے اور تیرے ہر پہلو سے کئی جلوے دکھائی

۱۔ پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی۔ اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۱۱

پڑتے ہیں۔ ہیرے نے زغال سے از راہِ ھمدردی کہا کہ پختگی خاک کو بھی نگینے میں بدل کر اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ میں نے بھی پختگی کی بدولت اپنے پیکر کو منوّر کر لیا۔ جب ہی تو میرا سینہ کئی جلوؤں سے معمور ہے۔ لیکن تم نے اپنے اندر پختگی پیدا نہیں کی اور وجود خام کے نتیجے میں تو دنیا میں خوار ہوا۔ خوف و غم اور وسواس کو اپنے دل سے نکال کر پتّھر کی طرح پختہ ہو جا۔ سخت کوش اور سخت گیر کی ضیا سے دونوں عالم مستنیز ہوتے ہیں۔ آخری اشعار میں سنگِ اسود کی مثال پیش کر کے انسان کو خود آگاہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ انسان کی آبرو صلابت میں ہے اور ناتوانی اور ناکسی ناپختگی کا دوسرا نام ہے۔

مُشتِ خاکے اصل سنگِ اسود است
کو سر از جیبِ حرم بیرون زد است
پختگیہا جست و خود آگاہ شد
زینتِ پہلوئے بیت اللہ شد
رتبہ اش از طور بالا تر شد است
بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے نزدیک "حکایت الماس وزغال" عنوان کے تحت اقبال نے جس مضمون کو پیش کیا ہے وہ بھی نطشے سے ماخوذ ہے۔ لکھتے ہیں:-

"کیمیاوی لحاظ سے ہیرا اور کوئلہ ایک ہی چیز ہے۔ ایک میں مرورِ ایام سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے وہ کمال سختی کی وجہ سے ہیرا بن جاتا ہے۔ سخت جانی سے زندگی میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا نرم رہنے کی وجہ سے

تیرہ روز رہتا ہے۔ نطشے کی اخلاقیات کا اوّل اوّلین جو اس کے مذہب کا کلمہ ہے یہ ہے کہ سخت ہو جاؤ۔ اس اصول کی تشریح میں نطشے نے بھی اس قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے۔"[1]

حکایت شیخ و برھمن اور گنگا و ہمالہ کا مکالمہ

(حیات ملیّ کا تسلسل قوم کی روایات مخصوصہ کے ساتھ قائم رکھنے پر منحصر ہے)

حیاتِ ملیہ کا تسلسل قوم کی روایاتِ مخصوصہ کے مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں پر دو حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک حکایت شیخ و برہمن کی ہے اور دوسری مکالمہ گنگا و ہمالہ کی ہے۔ ان دونوں حکایتوں کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ کسی قوم کی زندگی کا تسلسل مخصوص ملیّ روایات کی پابندی سے ممکن ہے۔ پہلی حکایت میں شیخ و برھمن کی رو سے بنارس میں ایک برھمن فرزانہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بود و عدم کے یم میں غرق رہا کرتا تھا۔ یہ روحانی پیشوا علم و حکمت کے سرمائے سے بہرہ مند تھا اور عارفانِ حق سے بھی ارادت رکھتا تھا۔ یہ سب سہی لیکن علم و دانش کے بل بوتے پر وہ زندگی کے اصل حقائق کو سمجھنے سے نابلد ہی رہا۔ اس نے بود و عدم کو علم و دانش کی مدد سے لاکھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس عقدے کو واہ کر سکا۔ آخر کار ایک روز ایک شیخ کامل کے پاس گیا۔ برھمن نے اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا۔ شیخ کامل نے اس روحانی پیشواء کی گفتگو غور سے سن کر اسے اس خاک کا رشتہ عہد وفا سے جوڑنے کی ہدایت کی اور اسے آگاہ کیا کہ ستاروں کا راز سمجھنے کی بجائے زمین کے تقاضوں کی تکمیل کر۔ خاک کے ذرّوں سے بے نیاز ہو کر گوہر انجم کیلئے فکر لاحاصل نہ کر۔ شیخ کامل نے برھمن کو بتوں سے بیزار نہ ہونے کی تعلیم دیکر اسے حقیقی معنوں میں آداب

1۔ پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی (مرتب) اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲

کافری کے اہل ہو جانے کی تلقین کی ہے

گفت شیخ اے طائفِ چرخِ بلند
اندکی عہد و فا برخاک بند
تا شدی آوارہ ی صحرا و دشت
فکرِ بیباک تو از گردوں گذشت
با زمین در سازای گردوں نورد
در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد
من نگویم از بتان بیزار شو
کافری شائستہ ی زنار شو

شیخ کامل نے برھمن فرزانہ سے اپنے آباء کے مسلک کو پسِ پشت نہ ڈالنے کی تلقین کی کیونکہ ملّت کی حیات جمعیت سے وابستہ ہے۔ کفر بھی جمعیت کا سرمایہ دار ہے۔ جب کوئی رسم کافری میں کامل نہ ہو، تو وہ درخور طوفِ حریم دل بھی نہیں۔ ہم دونوں جادۂ تسلیم سے دور جا پڑے ہیں۔ تو آذر سے اور میں ابراہیم سے دور ہوں ، تم نے اپنے وجود کے اندر خودی کی شمع کو گل کر رکھا ہے، اس لئے اگر تمہارا تخیل فلک پیما ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے الفاظ میں "شاعر مسلک آبائے تحفظ کو ملّی زندگی کے تسلسل کیلئے ضروری قرار دیتا ہے۔ اور خودی کی نگہبانی کو فکر فلک پیما کے مقابلے میں کہیں اہم سمجھتا ہے"[1]

اسرار خودی میں حکایات کے سلسلے کی ایک اور حکایت گنگا اور ہمالہ کے مابین ایک دلچسپ مکالمہ پر مشتمل ہے۔ دریائے گنگا نے کوہِ ہمالہ کو یہ طعنہ دیا کہ

---

[1] ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ ص۔ ۴۴

تو صبح ازل سے برف کی چادر اوڑھے کھڑا ہے اور تمہارا پیکر بہت سے دریاؤں سے زنار پوش ہے۔ یہ مانا کہ خدا نے تجھے آسمان کا ہم راز بنایا ہے لیکن تجھے خرامِ ناز سے محروم کر دیا ہے۔ پھر ترا یہ وقار، رفعت اور تمکین کس کام کی؟ جب کہ زندگی مسلسل خرام کا نام ہے۔ پہاڑ نے دریا کا یہ طعنہ سن کر مثلِ بحر آتشیں مغضوب ہو کر اپنی برتری اور فضیلت کا اظہار کرتے ہوئے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کرایا اور بتایا کہ جب میں خود کو تیرے آئینے میں دیکھتا ہوں تو تجھ جیسے صد ہا دریا مجھے اپنے سینے میں دکھائی دیتے ہیں۔ تیرا یہی خرامِ ناز تیرے فنا کا سامان ہے۔ اور جس نے بھی اپنی خودی کو کھو دیا جو خود سے بیگانہ ہوا۔ وہ شایانِ فنا ہے۔ اس کا انجام فنا ہے۔ تجھے اپنے مقام سے آگہی حاصل نہیں۔ پھر اپنے زیاں کو سود پر محمول کرنا تیری نادانی ہے۔ بے شک تو نے آسمان کے بطن سے جنم لیا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گنگا کا سرچشمہ آسمان ہے۔ لیکن تجھ سے بہتر ساحل افتادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر تو اپنے آپ پر اور کیا ظلم کر سکتا ہے اور تجھ سے بڑھ کر جاہل کون ہو سکتا ہے کہ تو نے اپنی ہستی کو قلزم کی نذر کر کے اپنی نقد جان کو اپنے ہی ہاتھوں رہزن کے حوالے کیا۔ زندگی اپنے مقام پر صلابت کے ساتھ قائم رہنے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا نام ہے۔ مجھ کو یہاں پر کھڑے ہو کر کتنے ہی قرن گذر گئے لیکن تیری دانست میں میں اپنی منزل سے دور ہوں، میں نے اپنے مقام پر جم کر اپنی ہستی میں بالیدگی حاصل کی جس کے نتیجے میں میں نے افلاک کی رفعتوں کو چھو لیا جب کہ تیری ہستی قلزم کے ساتھ مل کر بے نام و نشان ہو کر رہ گئی۔ میری نگاہیں فلک کے اسرار کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔ میرے کان فرشتوں کی پرواز سے آشنا ہیں۔ میں سعی پیہم کے سوز میں اس طرح جلا ہوں کہ میں نے لعل و گہر و الماس اپنے دامن میں بھر لیے۔ آخری اشعار میں پہاڑ

دریا کو نصیحت کرتا ہے کہ تیری حیثیت اگرچہ ایک قطرے کی سی ہے لیکن تجھے سمندروں سے برسرپیکار ہونے کیلئے بیقرار رہنا چاہئے۔

قطرہ ی! خود را بپای خود مریز
در تلاطم کوش و باقلزم ستیز
آب گوہر خواہ و گوہر ریزہ شو
بہر گوش شاہدی آویزہ شو
یا خود افزا شو سبک رفتار شو
ابر برق انداز و دریا بار شو
از تو قلزم گدیہ ی طوفان کند
شکوہ ہا از تنگیٔ داماں کند
کمتر از موج شمارد خویش را
پیش پای تو گذاد خویش را

ان اشعار میں پہاڑ دریا سے اپنی خودی کو بلند کرنے اور اپنی رفتار میں برق جیسی تیزی پیدا کرنے کی نصیحت کرتا ہے تاکہ قلزم بھی تیرے آگے اپنی تنگ دامانی پر شکوہ سنج ہو اور اپنے آپ کو موج سے کمتر سمجھ کر تیرے قدموں میں آکر گر پڑے۔

اقبالؔ نے متذکرہ بالا دو حکایات کے ذریعے ایسے فلک پیما تخیل اور ایسے ذوق خرام کے خطرناک اثرات سے باخبر کیا ہے جو اپنی ظاہری عظمت اور حرکت کے باوجود اپنی خودی کا تحفظ نہیں کرسکتے۔ اور فرد اور قوم کو اپنی روایات مخصوصہ ملّیہ سے جدا کردیتے ہیں حالانکہ روایات مخصوصہ ملّیہ کے تسلسل میں ان کی بقا کا سامان مضمر ہے۔ ان حکایات میں خودی کے تحفظ اور اس کی غیر معمولی قوتوں

کا ذکر کیا گیا ہے۔

اعلائے کلمتہ اللہ (جوع الارض کیلئے جہاد اسلام میں حرام ہے)

مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ ہے اور اگر جہاد کا محرک جوع الارض یعنی ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس ہو تو ایسا جہاد مذہب اسلام میں حرام ہے۔ اقبالؔ نے اس مسئلے کی توضیح ایک واقعے کے ذریعے کی ہے جس کا تعلق حضرت میاں میر (لاہور) اور ان کے مرید شاہ ہندوستان سے ہے۔ مذکورہ عنوان کی ابتداء ہی میں مسلمان کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی خودی کو صبغتہ اللہ یعنی خدا کے رنگ میں رنگ دے اور عشق کو ناموس و نام و ننگ دے۔ فطرت میں عشق کی بدولت مسلمان کو ایک قاہر کی حیثیت حاصل ہے اور مسلمان کا دل اگر عشق سے عاری ہو تو وہ کافر ہے۔ اقبالؔ کو نظیریؔ کا یہ مصرعہ اس قدر پسند تھا کہ ملک جم کے عوض بھی وہ نظیری کا یہ مصرعہ دینے کیلئے تیار نہیں۔

بملکِ جم ندہم مصرعہ نظیری را
"کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست"

مسلمان جب ہر لمحہ حکم حق کے تابع رہ کر زندگی کا ہر عمل حق کی خاطر کرے تو حق کی مرضی مومن کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ بعد کے اشعار میں شاہی لباس میں بھی درویش کی جیسی زندگی بسر کرنے اور دیدۂ حق بین اور حق اندیش ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

قرب حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار
صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را ناارجمند

ان اشعار کے بعد حضرت میاں میر ولی کو اتباع مصطفےٰؐ میں کامل بتا کر یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

بر طریق مصطفےٰؐ محکم پئی
نغمہ ی عشق و محبّت را نئی
تُربتش ایمانِ خاک شہر ما
مشعل نور ہدایت بہر ما
بر درِ او جُبّہ فرسا آسماں
از مریدانش شہ ہندوستاں

حضرت میاں میر ولی کا مرید شاہ ہندوستان ایک ایسا بندۂ حرص و ہوس تھا جس کا مقصدِ واحد ممالک کو تسخیر کرنا تھا۔ اس لئے ہر لمحہ اس کے دل میں ایک ملک کی تسخیر کے بعد دوسرے ملک کو مسخر کرنے کا لالچ انگڑائیاں لیتا رہتا تھا۔ حرص و ہوس کا یہ بندہ شہ ہندوستان حضرت میاں میر ولی کی خدمت میں جنگ میں کامیابی کے حصول کے مقصد سے حضرت میر سے طالب دعا ہوا۔ اتنے میں حضرت میر کی بزم میں ایک مرید باصفا آ پہنچا اور اپنے پیر کو چاندی کا ایک سکّہ نذر کر کے التجا کی کہ آپ تو بھولے بھٹکے ہوؤں کی اس جہاں میں دستگیری کرتے ہیں، میں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کر کے یہ درھم کمایا ہے۔ اس پر حضرت میر فرمانے لگے کہ اس درھم کے اصلی حقدار تو یہ ہمارے سلطان ہیں جو شاہی پوشاک زیب تن کرنے کے باوجود گداگر ہی رہے۔ مانا کہ یہ اس قدر بااختیار ہے

کہ اسے مہر و ماہ پر حکمرانی حاصل ہے لیکن یہ مفلس ترین شخص ہے۔ بعد کے اشعار میں سلطان کی جوع الارض کو ملک و قوم کے حق میں قضا سے تعبیر کر کے مسلمان سے فقط جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین کی گئی ہے۔

قحط و طاعون تابع شمشیر او
عالمی ویرانہ از تعمیر او
خلق در فریاد از ناداریش
از تہی دستی، ضعیف آزاریش
سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انسان کاروان اُو رہزن است
آتش جانِ گدا جوعِ گداست
جوع سلطان ملک و ملّت را فناست
ھر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغِ اُو در سینۂ ی او آرمید

نصیحت میر نجات نقشبند المعروف بابائے صحرائی بابت مسلمانانِ ھند:

اس عنوان کے تحت آنے والے اشعار میں اقبال نے فلسفۂ خودی اور ھندوستان کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہہ حالت کا ذکر میر نقشبند کی زبانی کیا ہے۔ اقبال نے اپنے شعری سفر کے مختلف مراحل میں اپنے نقطہ نگاہ یا پیغام کے کسی نہ کسی پہلو کی ترسیل اور ابلاغ کیلیۓ فرضی ناموں کا بھی سہارا لیا ہے۔ مثال کے طور پر "ضربِ کلیم" میں محراب گل افغان یا پھر "ارمغانِ حجاز" میں مُلا زادہ ضیغم لولابی (موخرالذکر نام کو بعض ناقدین نے مولانا انور شاہ کشمیری سے بھی تعبیر

کیا ہے) اقبال اپنے پیغام کے کسی نہ کسی پہلو کی ترسیل کیلئے مخصوص اور موزون نام کا تعین کر لیتے ہیں۔ بابائی صحرا نام کی نوعیت بھی فرضی قسم کی ہے، جنہیں اقبال نے فلسفۂ خودی اور مسلمانانِ ہند کی ناگفتہ بہہ حالت کا ذکر کرنے کی غرض سے متعین کیا ہے۔ موصوف کی زبانی مسلمانانِ ہند کو جو نصیحت کی گئی ہے اس کے مطابق مسلمان، جس کی پیدائش خودی کے بطن سے ہوئی ہے، اپنی خودی کو نظر انداز نہ کرے وہ قطرہ بن کر ہی رہے لیکن ایسا قطرہ جو بحر آشام ہو۔ اپنی خودی کو محکم کرنے کی صورت میں مسلمان محکم ہو جائے گا۔ مسلمان کیلئے فقط یہی فائدے کا سودا ہے اور اس دولت سے مالا مال ہونے والے کو خواجگی عطا کی جاتی ہے۔ مسلمان ہست ہو کر نیستی سے ہراساں ہو کر غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ اسے چاہئے کہ اپنی خودی میں ڈوب کر پھر اپنی خلوت گاہ سے باہر نکلے۔ اپنی خاکستر سے شرر پیدا کرے اور پھر شعلہ بن کر اپنی گرمی سے نظر افروز ہو جائے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے مرد گزاف۔ اس محنت چہل سالہ کو ترک کر کے شعلہ جوالہ کی مانند اپنا طواف کر۔ زندگی غیر کے طواف سے نجات حاصل کرنے کا نام ہے۔ تو اپنے آپ پر بیت الحرم کا گماں کر لے۔ اپنے بازوئے ہمت سے پرواز کر اور اس خاک سے آزاد ہو جا۔ اور طائر کی طرح خطرۂ افتاد سے بے خوف ہو جا۔ اے ہوشمند اگر تو طائر کی طرح پرواز کرنا نہیں جانتا تو پھر اس غار پر اپنا نشیمن مت بنا۔ اگر تو علم حاصل کرنے کا خواہاں ہے تو میں تجھے پیر روم کا وہ پیام سناتا ہوں جس میں بتایا گیا ہے کہ علم کا حصول اگر تن کی خاطر کیا جائے تو یہ تیرے حق میں سانپ ہے اور اگر اسے دل کی خاطر حاصل کیا جائے تو یہ تیرا یار ہے، اس کے بعد آنے والے اشعار میں علامہ اقبال نے مولانا روم کا قصہ بیان کیا ہے۔ شام کے مشہور شہر حلب میں مولانا روم کا ایک مکتب تھا، جہاں مولانا درس و تدریس کا کام انجام

دیتے تھے۔ مولانا علم و حکمت کے بے بہا موتی پرو دیتے تھے۔ لیکن ان کا علم معقولات پر مبنی تھا اور ان کی حیثیت ایک ایسے موسیٰؑ کی تھی جو بینائی عشق سے بیگانہ ہو۔ ان کے ارد گرد کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے بقول علامہ ؒ

برلب او شرحِ اسرارِ کتب

ایک روز حضرت شیخ کمال الدین جندیؒ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے مولانا شمس تبریزی، مولانا روم کے اس مکتب میں آئے اور جلال الدین رُومی سے اس غوغائے قیل و قال کے متعلق استفسار کیا۔ ایں قیاس و وھم و استدلال چیست۔ اس استفسار پر مولوی کو توہین کا احساس ہوا اور پیر تبریز سے آگے کچھ نہ کہنے اور خاموشی اختیار کرنے کی دھمکی دے کر اسے اسی وقت مکتب سے چلے جانے کیلئے کہا۔

مولوی فرمود نادان لب بہ بند
بر مقالاتِ خرد مندان مخند
پای خویش از مکتبم بیرون گذار
قیل و قال است ایں ترا باوی چہ کار
قال ما از فہم تو بالا تراست
شیشہ ی ادراک را روشنگر است

مولوی کے یہ متکبرانہ الفاظ سن کر مولانا شمس تبریز طیش میں آ گئے۔ دفعتہً ان کے دل سے ایک شعلہ بر آمد ہوا اور آتش دل سے بر آمد ہوئے اس شعلے نے ادراک کے اس انبار کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مولوی روم ابھی اعجاز عشق سے بیگانہ اور نغمہ ہائے عشق سے ناآشنا تھے، چنانچہ پیر تبریز سے دفتر ارباب حکمت کو نذر آتش کرنے کا سبب دریافت کیا۔ اس پر شیخ نے مولوی کو خاکِ خویش سے شعلہ

تعمیر کرنے اور ماسویٰ سے بیگانہ ہونے کی ہدایت کی کیونکہ علمِ مسلم سوزِ دل کی بدولت تکمیل پاتا ہے۔

گفت شیخ ای مسلمِ زنار دار
ذوق و حال است ایں ترا باوی چہ کار
حالِ ما از فکر تو بالا تر است
شعلہ ی ما کیمیائ احمر است
ساختی از برف حکمت ساز و برگ
از سحاب فکر تو بارد تگرگ
آتشی افروز از خاشاکِ خویش
شعلہ ی تعمیر کن از خاکِ خویش
علم مسلم کامل از سوز دل است
معنیٔ اسلام ترکِ آفل است
چوں زبند آفل ابراہیم رست
درمیان شعلہ ہا نیکو نشست

زیر بحث عنوان کے اگلے بند میں علم حق سے بے نیازی برتنے اور روٹی کی خاطر نقدِ دین کو فروخت کرنے پر گہرے تاسّف کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسان جس چیز کی تلاش و جستجو میں مدتوں سرگرداں رہتا ہے وہ چیز اسی کے پاس ہوتی ہے۔ بس اسے پہچاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک سُرمے کی جستجو مسلمان کو زار و حزین رکھتی ہے لیکن وہ اپنی چشم سیاہ یا نگاہِ سرمگیں سے ناواقف ہے۔ بھلے ہی انسان خنجر سے آبِ بقا طلب کرے اور اژدھا کے منہ سے کوثر طلب کرے اور خواہ بت خانے سے سنگ اسود مانگ لے بلکہ

ایک سگِ دیوانہ سے مشکِ نافہ کی تمنا کرے لیکن دانشِ حاضر سے سوزِ عشق ہرگز طلب نہ کرے، کیونکہ اس کافر کا جام معرفت کے کیف سے خالی ہے۔ اقبالؔ نے دانش حاضر کو سوز عشق سے بیگانہ پاکر اسے حجاب اکبر سے تعبیر کیا ہے کیونکہ دانش حاضر بت پرستی، بت فروشی اور بت گری کے سوا اور کچھ نہیں ۔

پا بزندان مظاہر بستہ ئی
از حدود حس برون ناجستہ ئی
در صراط زندگی از پا فتاد
بر گلوی خویشتن خنجر نہاد
آتشی دارد مثال لالہ سرد
شعلہ ئی دارد مثال ژالہ سرد
فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند
در جہان جستجو ناشاد ماند
عشق افلاطونِ علّت ھای عقل
بر شود از نشترش سودای عقل
جملہ عالم ساجد و مسجود عشق
سومنات عقل را محمود عشق
این می دیرینہ در میناش نیست
شورِ یارب قسمتِ شبہاش نیست

زیرِ بحث عنوان کے تیسرے اور آخری بند میں اپنی ملّت کی خودی سے ناآشنائی، دوسروں کے خوان سے ریزہ چینی، اپنے محور سے گریز، شعائرِ ملّت کو ترک کرنے اور غیر اسلامی شعائر کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کوئی تدبیر بجھانے

کا ذکر کیا گیا ہے۔

کعبہ آباد است از اصنام ما
خندہ زن کفر است بر اسلام ما
شیخ در عشق بتان اسلام باخت
رشتہ ی تسبیح از زنار ساخت
دل از نقش لا الہ بیگانہ ی
از صنم ہای ھوس بت خانہ ی
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست
اختیار ملّتِ بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بت خانہ دوخت
مفتی دین مبین فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رُخ سوی میخانہ دارد پیرؔ ما

موخر الذّکر شعر کو پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے خواجہ حافظ کے ایک شعر سے مقتبس قرار دیا ہے۔ شعر اس طرح ہے۔

دوش از مسجد سوئے بت میخانہ آمد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

وقت تلوار ہے:-

"اسرار خودی" کا اگلا عنوان "الوقت سیف" (وقت تلوار ہے) ہے۔ الوقت سیف حضرت امام شافعی کا مقولہ ہے۔ اور اقبالؔ نے یہ مقولہ حضرت امام شافعی سے مستعار لیا ہے۔ اقبال نے وقت کی تلوار کی آب و تاب کو سرمایہ دار

زندگی سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے مالک کو اندیشۂ بیم ورجا سے آزاد قرار دیا ہے۔ اس کا ہاتھ حکیم کے ید بیضا سے بھی روشن تر ہے۔ وقت کی تلوار کا مالک اس قدر غیر معمولی قوت اور اختیار رکھتا ہے کہ اس کی ضرب سے سنگِ خارا سے چشمے پھوٹ کر رواں ہوتے ہیں اور صاحبِ تلوار چاہے تو قلزم خشک ہو جاتے ہیں۔ اقبالؔ نے دہر خلاق کو ایک شمشیر سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے سفر کو مدام جاری قرار دیتے ہوئے اس کی خلاق قوتوں کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت علیؓ جیسے پیغمبروں کے یہاں کار فرما بتایا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں یہی شمشیر تھی جنہوں نے دریائے احمر کا سینہ چاک کر کے قلزم کو خاک کی طرح خشک کر دیا تھا اور مشہور و معروف خیبر گیر حضرت علیؓ بھی اسی شمشیر کے مالک تھے۔ اس کے بعد اقبالؔ کے نزدیک گردش گردونِ گردان مشاہدہ کرنے کی چیز ہے اور انقلاب روز و شب سمجھنے کی چیز ہے پھر انسان کس سبب کے تحت دوش و فردا کا اسیر ہو کر رہے جب کہ اس کے دل کے اندر ایک عجیب دنیا پنہاں ہے۔ دوش و فردا کا اسیر ہو کر انسان اپنے پیکر کے اندر ظلمت کا بیج بوتا ہے اور وقت کو ایک خط تصور کرتا ہے۔ لیل و نہار کا پیمانہ لیکر وہ طول روزگار کو ناپتا رہتا ہے۔ اس طرح انسان رشتہ اوقات کو زنار پوش کر دیتا ہے۔ انسان جو کہ سرِّ حق پیدا ہوا تھا، صرف باطل ہو کر رہ جاتا ہے، اس طرح کیمیا صفت انسان مٹھی بھر خاک کے برابر ہو جاتا ہے۔ مسلمان کو اس زنار سے رہائی پانے اور ملت احرار کی بزم کی شمع ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ جب انسان دنیا کی حقیقت سے آگاہ نہیں تو وہ کیونکر حیات جاوداں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کب تک روز و شب کا اسیر ہو کر رہے۔ روز و شب کا اسیر ہو کر وقت کے رمز کو سمجھنا ممکن نہیں۔ وقت کے رمز سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے لی مع اللہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ وقت کی حقیقت

آفتاب کی گردش کا نام نہیں بلکہ وقت ایک جاوداں حقیقت ہے۔ خورشید جاوداں نہیں۔ اقبال نے وقت کو خدائی صفات عطا کی ہیں جس کی بناء پر بعض اسلامی حلقوں کی طرف سے ان پر الحاد اور دہریت کے الزامات عاید کیے گئے۔ لیکن ۱۹۳۲ء کی تصنیف "جاوید نامہ" میں اگر ہم زروان کی تقریر کے اختتام پر غور کریں کہ یہ دنیا میرے طلسم میں اسیر ہے لیکن جس دل میں لی مع اللہ ہے وہ جوان مرد میرے طلسم کو توڑ سکتا ہے۔ اس میں ایک حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس طرح ہے۔ لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل یعنی میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے۔ نہ نبی مرسل کی۔ تو اقبال اس الزام سے بری قرار دئے جا سکتے ہیں۔

وقت کیا ہے؟

عیش و غم عاشور و ہم عید است وقت
سر تابِ ماہ و خورشید است وقت

وقت کو مکان کے مثل سمجھ کر دوش و فردا کا امتیاز قائم کرنا سراسر غلط ہے۔ انسان نے مثل بُو اپنے باغ سے رم کر کے اپنے آپ کو زندان میں قید کر لیا۔ وقت کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ وقت ہمارے ضمیر کے خیابان کی پیداوار ہے۔ وقت کی حقیقت کا عرفان حاصل کرنے والا زندہ سے زندہ تر ہو جاتا ہے۔ اس کی ہستی میں سحر کی تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی زمانہ ہے اور زمانہ زندگی ہے۔ اس لئے زمانے کو برا نہ کہو۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ لا تسبو الدھر فانی الدھر ھوا للہ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے نزدیک اسرار خودی میں "الوقت سیف" (امام شافعی کا مقولہ) عنوان کے تحت کہے گئے اشعار برگسان کے خیالات ہی کی تفسیر ہیں۔ لیکن یہاں اقبال نے برگسان کو acknowledge

نہیں کیا۔ جب کہ برگسان کے ان خیالات کو توحید کے مقابلے میں دھریت سے زیادہ قریب تر بتایا گیا ہے۔ جنھوں نے دھر ہی کو اصل حقیقت قرار دیا ہے۔ اور دھر کو وقت قرار دیکر وقت کی ماہیت بیان کی ہے۔ اقبال نے حدیث قدسی لا تسبو الدھر کی مدد سے برگسان کی دھریت کو توحید کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"حقیقتِ وقت اور سیلانِ حیات کے متعلق جو اشعار یا نظمیں ہیں وہ برگسان سے ماخوذ ہیں۔ برگسان کا اثر اقبالؔ پر اسرار خودی کے بعد بھی قائم رہا۔ افسوس ہے کہ "اسرار خودی" میں اقبالؔ نے برگسان کا نام نہیں لیا اور اس کا تمام فلسفۂ وقت حضرت امام شافعی کے ایک قول کے ماتحت نظم کر دیا ہے۔ حضرت امام شافعی کے قول کے تحت میں کوئی فلسفہ نہیں تھا۔ جو فلسفہ اقبالؔ نے برگسان سے لیکر اس قول کی تفسیر میں پیش کر دیا ہے وہ خود امام صاحب کی سمجھ میں نہ آتا۔ ان کا تدین اور تورّع ایسے افکار سے گریزاں تھا۔ برگسان کا یہ فلسفہ توحید کے مقابلے میں دہریت سے زیادہ قریب ہے۔ برگسان دھر ہی کو اصل حقیقت تصور کرتا ہے اور دھر کو وقت قرار دیکر وقت کی ماہیت کو بڑی نکتہ رسی سے بیان کرتا ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ زمان یا وقت مکان سے بالکل الگ چیز ہے۔ مگر عام بطور پر نفس انسانی زمان کو بھی مکان ہی پر قیاس کرتا ہے۔ زمانہ ایک لامکانی اور تخلیقی قوت ہے۔ تغیر اور ارتقاء اس کی ماہیت میں داخل ہیں۔ اور اس کے سوا کسی حقیقت ثابتہ کا وجود نہیں۔ اقبالؔ نے لا تسبو الدھر کی حدیث قدسی سے مدد لیکر برگسان کی دہریت کو توحید کا ہم رنگ بنانے کی کوشش کی ہے"[1]

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے خیال میں اقبال نے "الوقت سیف" (جسے

---

[1] پروفیسر اے۔ جی۔ نیازی۔ (مرتب) اقبال کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۱۱۲

انہوں نے حضرت شافعی کا مقولہ بتایا ہے) رومی کے ہاں سے لیا ہے اور وہ مولانا روم کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ۔

قال اطعمنی فانی جائع
فاعتجل فالوقت سیف قاطع

اور اقبال کا یہ شعر درج کیا ہے ۔

فکر اُو کوکب زگردوں چیدہ است
سیف بُراں وقت را نامیدہ است

لکھتے ہیں: "اس شعر کے ضمن میں اقبال نے الوقت سیف کو حضرت امام شافعی کا مقولہ بتایا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں کہ یہ مقولہ حضرت امام شافعی ہی کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مقولہ اقبال کو ملا کہاں سے؟ میرے خیال میں اقبال نے یہ بھی امام شافعی کے ہاں سے نہیں، رومی کے ہاں سے لیا ہے"[1]

اقبال دوسرے موضوعات کی طرح مسئلہ زمان پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ "اسرار خودی" کے علاوہ تصور زمان کو انہوں نے اپنی دوسری تصانیف جیسے بال جبرئیل، ضربِ کلیم، پیام مشرق، جاوید نامہ اور زبور عجم میں بھی موضوعِ فکر بنایا ہے۔ ان منظوم تصانیف کے علاوہ اپنے انگریزی خطبات "Reconstruction of religious thought in Islam" میں مسئلہ زمان کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسے مسلمانوں اور انسانوں کیلئے زندگی اور موت کا سوال قرار دیا ہے۔ زمان کے متعلق اقبال کے تصورات میں بتدریج ارتقاء ہوا ہے۔ ان میں فرانسیسی مفکر برگسان کے زورِ فکر اور قوتِ استدلال نے وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے۔ اقبال نے برگسان کے فلسفے سے

۱۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی۔ مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال۔ ص۔ ۵۶۵

اکتساب فیض کرنے کا بھی خود اعتراف کیا ہے۔ گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران اقبال اس بڑے مفکّر سے تبادلۂ خیالات کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو تصوّر زمان پر بحث کے دوران اقبال نے برگسان کو جب نبی اکرم ﷺ کی حدیث لاتسبو الدھر سنائی تو اقبال کے الفاظ میں برگسان یہ حدیث سن کر اچھل پڑا اور اس کی روح بے انتہا مسرّت سے لبریز ہو گئی کہ ایک نبیٔ عظیم ﷺ کے قلب پر وہی حقیقت وارد ہوئی جسے وہ استدلال اور ذاتی وجدان کی بناء پر دنیا کے سامنے عمر بھر پیش کرتا رہا۔ "الوقت سیف" کے پہلے بند میں وقت اور فرد کے باہمی تعلق پر بحث کرنے کے بعد اس کے دوسرے بند میں وقت کے متعلق ایک روشن نکتے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس بند میں عبد اور حُر یعنی غلام اور آزاد کے رویئے میں فرق بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عبد لیل و نہار میں گم ہو جاتا ہے وہ روز و شب کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف آزاد لیل و نہار کے طلسم کو توڑ کر روز گار کو اپنے دل کے اندر گم کر دیتا ہے۔ حُر مٹی کے اس طلسم سے اوپر اٹھ کر روز گار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ خالص وقت میں رہتا ہے۔ اور آزاد اور خلاق کی حیثیت سے رہتا ہے۔ جب کہ غلام پیمائشی وقت میں رہتا ہے اور خلاقی اور آزادی سے محروم رہتا ہے۔ عبد یعنی غلام ہر وقت ایک طائر کی طرح دام میں اسیر رہتا ہے اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے لذّتِ پرواز کو حرام کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس حُر ایّام کے طائر کو اسیر کر لیتا ہے۔ اس کا کام ہر لمحہ تازہ کاری ہے۔ عبد ایّام کی زنجیر میں اُلجھ کر تقدیر کی شکایت کرتا رہتا ہے جب کہ حُر کی ہمت خود قضا کی ھمکار ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھوں حادثات صورت پذیر ہوتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل دونوں اس کی ہستی میں محو ہو جاتے ہیں۔

عبد را ایام زنجیر است و بس
برلبِ او حرفِ تقدیر است و بس
ھمتِ حر باقضا گردد مشیر
حادثات از دستِ اُو صورت پذیر
نکتہ ی غیب و حضور اندر دل است
رمز ایام و مرور اندر دل است
نغمہ ی خاموش دارد سازِ وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

برگسان کے یہاں وقت کا جو تصور ملتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) پیمائشی وقت (۲) خالص وقت۔ وقت کی اس پہلی قسم پیمائشی وقت (Serial time) کو دن، رات، ہفتہ۔ ماہ اور سال میں ناپا جاسکتا ہے۔ اسے محدود وقت کے نام سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دقت کی دوسری قسم خالص وقت (Duration) ہے، جسے برگسان دوران کا نام بھی دیتے ہیں۔ اقبالؔ اسے زمانے کی رو کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم "مسجد قرطبہ" کے اس شعر میں ؎

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

یہ خالص وقت کیا ہے؟ اس کے متعلق اقبالؔ اپنے خطبات "Reconstruction of religious thought in Islam" میں لکھتے ہیں:۔

"To exist in real time is not to be bound by the fetters of serial time, but to create it from moment

to moment and to be absolutely free and original in creation. In fact, all creative activity is free activity" [1]

"خالص وقت میں رہنے کے معنی ہیں پیمائشی وقت کی زنجیروں سے آزاد ہونا اور لمحہ بہ لمحہ تخلیق میں مصروف رہنا اور اپنی تخلیق میں بالکل آزاد اور تازہ کار ہونا۔ دراصل تمام تخلیقی عمل آزاد عمل ہے"

دوران خالص یا خالص وقت کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ بس یہ ایک ذہنی، نفسیاتی یا روحانی کیفیت کا نام ہے جسے اضافی یا اعتباری کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور اقبال نے اس دوران خالص کو ایک شاعرانہ حقیقت کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔

الوقت سیف کے تیسرے اور آخری بند میں اقبال ان ایام کو یاد کرتے ہیں جب یہی سیف روزگار مسلمان کے ہاتھ میں تھی اور یہ اس کے دست وبازو کا کام دیتی تھی۔ اس وقت کی تخلیقی اور تعمیری عظمت کو شاعر دیکھئے کیسے یاد کررہا ہے۔

جام ماهم زیب محفل بوده است
سینه ی ما صاحب دل بوده است
عصر نو از جلوه ها آراسته
از غبار پای ما بهر خاسته
عالم از ما صاحبِ تکبیر شد
از گلِ ما کعبه ها تعمیر شد

1..Sir Mohammad Iqbal- The Reconstruction of religious thought in Islam- (1975) p. 51

حرف اِقراء حق بما تعلیم کرد
رزقِ خویش از دستِ ما تقسیم کرد

اگرچہ یہ تاج و نگین اب ہمارے ہاتھوں میں نہ رہا۔ ہم زیاں کار ضرور ہیں اور ہمیں بخوبی اس کا احساس ہے لیکن ہمیں اعتبار لاالہٰ حاصل ہے اور وہی دونوں جہاں میں ہمارا نگہدار ہے۔ اس لئے اقبالؔ ناامید نہیں۔ وہ مسلمان کو اپنی عظمت کے حوالے سے اپنی صلاحیتوں کو پھر سے بروئے کار لانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا وارث بنا کر اسے پیغمبرانہ شان کا حامل بنایا ہے اور اب بھی سورج اور چاند میں ہماری آب و تاب ہے۔ ہمارا اسحاب اب بھی اپنے اندر برق ہار کھے ہوئے ہے۔ ہماری ذات ذاتِ حق کا آئینہ ہے اور مسلمان کی ہستی آیات حق ہے۔

دُعا:-

مثنوی "اسرار خودی" کا اختتام دعا پر ہوتا ہے۔ دعا کے تحت آنے والے اشعار میں اقبالؔ نہایت پُرسوز لہجے میں ذات ایزدی کی مسلمانوں سے بیزاری کا سبب پوچھتے ہوئے اسے وجود عالم کے اندر جان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے چو جان اندر وجود عالمی
جان ماباشی و از ما می رمی
نغمہ از فیضِ تو در عود[1] حیات
موت در راہ تو محسود حیات

اس کے بعد ذاتِ ایزدی سے مسلمانوں کے سینوں کو پھر سے عشق کی دولت سے

---

[1] ایک قسم کا ساز۔ بقول اقبالؔ ۔ نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے

آباد کرنے اور عاشقان خام کو پختگی عطا کرنے اور ملتِ اسلامیہ کو سر بلند کرنے کی دعا کی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو پھر سے وہی خصوصیات عطا کرنے کی دعا کی گئی ہے جو کسی زمانے میں ان سے مخصوص تھیں۔

از تہید ستانِ رُخِ زیبا مپوش
عشق سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب دہ
باز مارا فطرتِ سیماب دہ
آیتی بنماز آیات مُبین
تاشود اعناقِ اعدا خاضعین[1]
کوہ آتش خیز کن ایں کاہ را
ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رشتۂ وحدت کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں قوم کے مختلف امور میں صدہا رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ اور ہم دنیا میں اسی طرح پریشان ہوگئے جس طرح ستارے آسمان پر پریشان نظر آتے ہیں۔ یوں تو ہم رشتۂ وحدت میں بندھے ہوئے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے یکسر بیگانگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے اوراقِ پریشان کی پھر سے شیرازہ بندی ہو تاکہ دنیا میں آئینِ محبت دوبارہ تازہ ہو۔ ہم بھولے بھٹکے مسافروں کو اپنی اصل منزل کی طرف رہنمائی ہو اور پھر سے ہمیں ایمان ابراہیمؑ عطا ہو۔

۱۔ اس شعر کے مصرعہ ثانی میں اس قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ انشا ننزل علیھم من السماء آیۃ فضلت اعنا قھم لھا خاضعین ۔اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ایسا نشان اتار دیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے بالکل جھک جائیں۔

باز ما را بر ھمان خدمت گذار
کار خود با عاشقانِ خود سپار
رھروان را منزل تسلیم بخش
قوّت ایمانِ ابراہیمؑ بخش
عشق را از شغل لَا آگاہ کن
آشنای رمزِ اِلااللہ کن

دعا کے دوسرے اور آخری بند میں اقبال نے خداوند تعالیٰ سے اس جہاں کی بھری انجمن میں اپنی تنہائی کا گلہ کرتے ہوئے استفسار کیا ہے کہ اسے اپنے غمگسار کیلئے کب تک منتظر رہنا ہوگا۔ شاعر اس اضطراب کا اظہار کر رہا ہے جو اس کے دل کو بے چین کئے ہوئے ہے اور جب اسے کوئی غمگسار نہیں ملتا تو خدا سے کہتا ہے کہ تو نے جو امانت مجھے سونپی ہے مجھ سے وہ تنہا سنبھالی نہیں جا رہی ہے۔ چونکہ میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں۔ اس لئے مجھے بخشے ہوئے شعلے کو یا تو مجھ سے چھین لے یا اپنی امانت کو واپس لے لے۔ نہیں تو مجھے میرا کوئی ہمدم دیرینہ عطا کر کے مجھے میرے عشقِ عالم سوز کا آئینہ دے دے، ہم دمِ دیرینہ کی تمنا میں شاعر فطرت کے مختلف مظاہر کے حوالے سے ہر مظہر فطرت کو اس کا ہمدم اور ہمراز میسّر آنے کا ذکر بڑے حسن و خوبی کے ساتھ کرتا ہے۔

موج در بحر است ھم پہلوئے موج
ھست با ھمدم تپیدن خوی موج
بر فلک کوکب ندِیم کوکبست
ماہِ تاباں سر بزانوی شب است

روز پہلو ی شب یلدا زند
خویش را امروز بر فردا زند
ھستیِ جوئی بجوئی گم شود
موجۂ بادی ببوئی گم شود

اور پھر ؎

ہست در ھر گوشہ ی ویرانہ رقص
میکند دیوانہ با دیوانہ رقص

اس کے بعد ذات ایزدی سے کہا گیا ہے کہ بے شک تو اپنی ذات میں یکتا ہے لیکن تو نے بھی اپنی خاطر جہاں کو خلق کیا۔ میری مثال اس لالہ صحرا کی ہے جو بھری انجمن میں تنہا ہو۔ آخری اشعار میں خداوند تعالیٰ سے ایک ایسے ہمدم کو عطا کرنے کی دعا کی گئی ہے جو شاعر کی فطرت کے رموز سے آگاہ ہو۔ اس کا ہم دم فرزانہ ہو۔ وہ ایں و آں کے خیال سے بیگانہ ہو تاکہ شاعر اسے اپنی وحشت سونپ کر اس کے دل میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ سکے یا جس کی بے تاب تمناؤں کا عکس شاعر اپنی ذات کے اندر دیکھ سکے۔ اور پھر ؎

سازم از مُشتِ گلِ خود پیکرش
ھم صنم او را شوم ھم آذرش





IQBAL INSTITUTE

UNIVERSITY OF KASHMIR
SRINAGAR.